© rasailojaraid.com

رشید احمد (جالندھری)

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا قدیم نصاب تعلیم

تاریخ اسلام میں تحصیل علم نہ صرف ایک اجتماعی تقاضا تھا بلکہ دینی فریضہ بھی تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلا خدائی خطاب ہی "پڑھیے" (اقرا) سے شروع ہوتا ہے، قرآن مجید میں آیا ہے: (اے پیغمبر) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھیے جس نے کائنات کو پیدا کیا، جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، پڑھیے (اور خدا پر بھروسہ رکھیے) کہ آپ کا خدا بڑا کریم ہے۔" (۹۶:۵) اور پیغمبرؐ ہی سے دوبارہ کہا گیا کہ: اور کہئے میرے پروردگار! مجھے اور زیادہ علم دے" (۲۰:۱۱۴)

قرآن پاک نے علم کو روشنی اور جہالت کو تاریکی سے تعبیر کیا ہے اور بار بار انسان کو گزشتہ قوموں کی ترقی و کمال اور شکست و ریخت کی تاریخ پڑھنے اور فطرت کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے، لیکن جو لوگ ایسا نہیں کرتے، فکر و نظر سے کام نہیں لیتے اور سچائی کا ساتھ نہیں دیتے، وہ زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ (اولئک هم الغافلون) یہی غفلت اور یہی جہالت قیامت کے دن ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان حجاب بن جائے گی اور وہ اپنے رب کی خشنودی و قربت سے محروم رہیں گے۔

صحیح احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کو علم سے گہرا لگاؤ تھا، آپ نے ایک حدیث میں فرمایا:- خدایا! مجھے اشیاء کا، جیسی وہ حقیقت میں ہیں، علم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عطا فرما۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا کہ آدمی دو حلقوں میں بیٹھے ہیں، ایک حلقہ اللہ کے ذکر میں سرمست ہے اور دوسرا حصول علم میں، "دونوں حلقے خوب کام کر رہے ہیں لیکن دوسرا حلقہ خوب تر ہے" آپ نے فرمایا۔ پھر آپ نے اسی دوسرے حلقے کو اپنی شرکت سے رونق بخشی۔ رسول کریمؐ نے جہاں تحصیل علم کے لیے چین تک جانے کی تلقین فرمائی وہاں بے فیض علم سے پناہ بھی مانگی۔ (اللھم اعوذ بک من علم لاینفع) چنانچہ علم نہ صرف تلاش حق میں رہنمائی کرتا ہے بلکہ سچائی میں ڈھلنے کی تلقین بھی کرتا ہے، طبیعات ہو یا الہیات، فطرت ہو یا تاریخ اگر ان کا علم آدمی کے سامنے حق شناسی اور حق پرستی کی راہ کھولتا ہے، تو یہ علم یقیناً سودمند ہے وگرنہ "بے فیض" (لاینفع) یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں تحصیل علم کا مقصد حقیقت کبریٰ کا سراغ لگانا، اخلاقی اور روحانی قدروں کا حصول رہا ہے۔ علم کو جب کبھی دنیا طلبی کا ذریعہ بنایا گیا تو اہل نظر نے برا مانا اور ایسے لوگوں کو علمائے سوء کے نام سے یاد کیا۔ رومی نے ایسے علم کو انسان کے لیے مہلک قرار دیا اور فرمایا:

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بردل زنی یارے بود

جب قرآن مجید اور سنت رسولؐ نے مسلمانوں کی خوابیدہ فکری طاقتوں کو بیدار کیا اور ان کے سامنے معنوی زندگی کی ایک نئی راہ کھولی تو انھوں نے بڑی محنت، لگن اور اخلاص سے علمی سرمایہ فراہم کیا اور فکر و نظر کے تمام شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں، یہ علم ہی سے گہرا شغف تھا کہ عربوں نے یونان اور ہندوستان کے فلسفہ و حکمت کو عربی زبان میں منتقل کیا اور غیر مسلم قوموں کی زبان [illegible] کا [illegible] سے کام [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قدم رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ یہ علم ہی سے گہری عقیدت کا نتیجہ تھا کہ جب بغداد، اصفہان اور شیراز میں پہلی بار سرکاری طور پر مدارس کا قیام عمل میں آیا، تو علمائے ماوراء النہر نے علم کے سوگ میں صف ماتم بچھائی اور کہا کہ آج سے علم کا وقار رخصت ہوا، اب تک تو ارباب ہمت اور اصحاب دل (اصحاب نفوس زکیہ) تحصیل علم کے بعد افادہ و استفادہ کی محفلیں آراستہ کرتے تھے، اب جب کہ علم پر اجرت لی جائے گی، پست فطرت اور دوں ہمت لوگ علم کا رخ کریں گے اور ضیاع علم کے لیے یہی بات سب سے بڑی آفت ہے۔ (۱) ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو زندگی کی بلند قدروں کا کس حد تک گرویدہ بنا دیا تھا، چنانچہ یہ امر ہمارے لیے موجب حیرت نہیں کہ مذہب، نصاب تعلیم میں برابر بنیادی کردار ادا کرتا رہا اور صدیوں تک بزم علم میں منقولات اور معقولات میں یگانگت رہی، مذہب اور فلسفہ میں دوستی کا رشتہ برقرار رہا اور تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق راہ نہ پا سکی، حتیٰ کہ مسلمانوں کے دور انحطاط میں بھی یہ وحدت کسی نہ کسی صورت میں باقی رہی اور علم کا بلند مقصد اہل نظر کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا، 'کتاب الاخیار' میں شیخ عبدالحق دہلوی اپنے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ''ایک دن چند طالب علم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ آخر وہ کس نیت سے علم حاصل کر رہے ہیں؟ بعض لڑکوں نے ازراہ تصنع کہا کہ تحصیل علم سے ہمارا مقصد ذات الٰہی کا عرفان ہے، ایک دوسرے طالب علم نے ذرا سچائی سے کام لیتے ہوئے بے تکلف کہا کہ حصول علم سے اس کا مقصد صرف دنیا طلبی (حطام دنیا) ہے، آخر میں شیخ سے جو اس وقت نحو کی کتاب کافیہ پڑھ رہے تھے، پوچھا گیا کہ وہ کس ارادہ سے تحصیل علم کر رہے ہیں اور ان کی نگاہ عزم و ہمت کے سامنے کون سی منزل ہے؟ شیخ نے جواب میں کہا کہ اب تو مجھے اس امر کی مطلقاً خبر نہیں کہ حصول علم کے بعد اللہ کی معرفت میسر آئے گی یا لہو و لعب کی دنیا! سردست مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات جاننے کا شوق ہے کہ قدیم اہل علم و عقل نے (زندگی کے مسائل) میں کیا کہا ہے؟ اور ان مسائل میں تلاش حق اور ادراک حقیقت کے لیے انہوں نے (سلک بیان) میں کیا کیا موتی پروئے ہیں؟ (۲) (چہ درہا سفتہ اند)

شروع میں مسجد کے صحن تعلیم کے لیے استعمال ہوتے تھے، مسجد کا قیام جہاں بندہ و آقا کے باہمی مساویانہ تعلقات کا نشان تھا، وہاں وہ فکری سعی و نشاط کی علامت بھی تھا۔ مسجد و تعلیم کے قدیم تعلق کو دیکھ کر مسجد اور تعلیم کو دو مترادف الفاظ قرار دینا شاید بے جا نہ ہوگا، خود عہد رسالتؐ میں چند صحابہ کرامؓ نے جو اصحاب صفہ کے نام سے معروف ہیں، مسجد ہی میں تعلیم حاصل کی تھی، ایک ہی مسجد میں درس و تدریس کے کئی حلقے جمتے، مثلاً اگر ایک حلقے میں استاد فن نحو پر لیکچر دیتا ہے تو دوسرا استاد اپنے حلقے میں تفسیر یا حدیث پر درس دیتا، اسی طرح مسجد کے تیسرے گوشہ میں شعر و ادب پر مذاکرہ ہوتا، بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ اگر مسجد کے ایک گوشے میں باپ لیکچر دے رہا ہے، تو بیٹا دوسرے ستون کے پاس اپنی بزم تدریس جمائے بیٹھا ہے، ہر آدمی اپنے علمی مذاق کے مطابق حلقے انتخاب کرتا اور جب چاہتا اپنے حلقے کو بدل بھی لیتا، یا خود اپنا نیا حلقہ قائم کر لیتا۔ حسن بصری کے حلقے میں واصل بن عطا اور عمرو بن عبید جیسے بلند پایہ لوگ شریک ہوتے، ایک دن واصل بن عطا نے کسی ایک مسئلے میں اپنے استاد سے اختلاف کیا اور پھر اپنے استاد (حسن بصری) کا حلقہ چھوڑ کر اپنا حلقہ قائم کر لیا۔ جب مرور وقت کے بعد فقہی مذاہب وجود میں آئے تو ایک ہی مسجد میں مالکی، شافعی اور حنفیوں کے حلقے جمتے جس میں بڑے بڑے ائمہ فن درس دیتے۔ ایسے ہی فقہا، قراء اور ادباء کے نام سے بھی حلقے جمتے، غرضیکہ مسجد بہ قول احمد امین رسول کریمؐ کے عہد مبارک سے لے کر بنو امیہ اور عباسی عہد کے دور ثانی تک (جو متوکل باللہ تک رہا) عبادت کے ساتھ ساتھ دانش گاہ کا کام بھی دیتی رہی، پوری مسلم دنیا کے بڑے بڑے مرکزی شہروں، مکہ، مدینہ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بصرہ، کوفہ، دمشق، بغداد کی مساجد میں درس و تدریس کا غلغلہ بپا رہتا۔ اگر کعبہ کے صحن میں حضرت عبداللہ بن عباس بساط تدریس بچھاتے اور تفسیر، حدیث اور ادب میں داد تحقیق دیتے تو مسجد نبویؐ میں حضرت ربیعہ بزم علم آراستہ کرتے، جس میں مالک بن انس، حسن اور اس پایہ کے لوگ شریک ہوتے، بصرہ میں حسن بصری حلقہ جماتے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ شروع شروع میں مسجد میں قرآن اورحدیث کی تعلیم دی جاتی تھی، اموی دور میں فقہاء نے فقہ کا درس دینا شروع کر دیا اور جب مرور وقت کے ساتھ ساتھ نئے نئے علوم وجود میں آنے لگے جیسا کہ فن نحو اور علم کلام، تو ان کی تدریس بھی مسجد ہی میں ہوتی تھی، حتی کہ مسجد میں شعر و ادب کی بزم بھی جمتی۔ الکمیت اور حماد راویہ کوفہ کی مسجد میں بیٹھ کر اشعار اور عرب واقعات پر مذاکرہ کرتے اور بعض اوقات اپنے ادبی افکار کے حسن و قبح کا فیصلہ کرانے کے لیے کسی کو حکم بھی بنا لیتے۔ ہارون الرشید کا معروف شاعر ابوالعتاہیہ مسجد میں اپنے شعروں کی داد وصول کرتا تھا۔ غرضیکہ اس پایہ کے دوسرے ادیب اور شاعر مسجد میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ درس و تدریس کے ان حلقوں میں کوئی درجہ بندی بھی نہیں تھی مثلاً یہ حلقہ ابتدائی تعلیم کے لیے ہے، دوسرا ثانوی تعلیم کے لیے اور تیسرا حلقہ اعلی تعلیم کے لیے۔ البتہ مکتب میں (جسے کتاب بھی کہا جاتا ہے) بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی، مکتب میں قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا اور لکھنا پڑھنا بھی، اور بعض ابتدائی مدارس میں عربی زبان بھی پڑھائی جاتی تھی۔ مکتب کی تعلیم میں بچوں کی پٹائی بھی ہوتی تھی اور پڑھانے والے ٹیچر کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا۔ مکتب کا ٹیچر بہ قول جاحظ حماقت میں ضرب المثل بن گیا تھا۔ کہا جاتا تھا "وہ مکتب کے ٹیچر سے بھی زیادہ احمق ہے۔" (۳) (ھو احمق من معلم کتاب)۔ ابن خلدون نے اپنی مشہور کتاب 'مقدمہ' میں بچوں کی تعلیم کے موضوع پر عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ بچوں کو قرآن پاک پڑھانا دین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ایک ایسی علامت ہے جس پر گویا پوری امت اتفاق کر چکی ہے' اس سے ایمان اور عقائد جو قرآنی آیات اوراحادیث سے ماخوذ ہیں' لوح قلب پر پوری طرح سے نقش ہو جاتے ہیں' قرآن دراصل تعلیم کی بنیاد بن گیا ہے' جس پر آگے چل کر بچے کے عادات و خصائل استوار ہوتے ہیں' اس لیے کہ بچپن کی تعلیم بڑی پختہ ہوتی ہے اور آئندہ تعلیم کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہے البتہ قرآن پڑھانے کے بارے میں مختلف مسلم ممالک میں طریق تدریس ایک نہیں ہے مثلاً "مغرب میں صرف قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے' اس کے ساتھ حدیث' فقہ' شعر یا کلام عرب پڑھایا نہیں جاتا' یہ طریقہ' افریقہ میں بھی رائج ہے' لیکن اندلس میں قرآن مجید' جو دین کا سرچشمہ ہے اور تعلیم کی بنیاد' کے ساتھ ساتھ عربی شعر' عربی زبان کی گرائمر اور خوش خطی بھی سکھائی جاتی ہے۔ ابن خلدون نے قاضی ابن العربی کی ایک کتاب "الرحلۃ" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بچے کو عربی زبان اور شاعری پڑھانی چاہیے کیوں کہ شاعری عرب زندگی کا ریکارڈ ہے' اگر ایسا نہ کیا گیا جیسا کہ اب ہے تو اس سے عربی زبان میں خلل واقع ہو جائے گا۔ اس کے بعد حساب اور قرآن مجید اور دوسرے علوم پڑھائے جائیں۔ قاضی ابن العربی نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بچوں کو عربی زبان پڑھائے بغیر قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے جسے وہ سمجھتے تک نہیں' ابن خلدون نے قاضی موصوف کے طریق تدریس کو پسند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر اس بات کا یقین ہو جائے کہ بچہ اپنی تعلیم کو برابر جاری رکھے گا تو پھر قاضی ابن العربی کا مسلک اور طریق تدریس بہتر ہے' یہ بس حالات کی مجبوری ہے کہ بچے کو آغاز میں قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے۔ والدین یہ چاہتے ہیں کہ بچے ان کی نگرانی میں قرآن پاک پڑھ جائیں۔ اگر وہ آگے چل کر کسی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکیں تو وہ کم از کم قرآن پاک کی برکت اور ثواب سے تو محروم نہ رہیں' (۴) تعلیم میں بچوں پر سختی بہ قول ابن خلدون بچوں میں مکر و فریب' جھوٹ اور نفاق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خصائل پیدا کرتی ہے۔

مسجد میں تعلیم حکومت کی سرپرستی سے آزاد رہی اور حکومت نے بھی کسی منصوبے کے تحت نہ تو تعلیم کے لیے کوئی نصاب مقرر کیا اور نہ ہی اہل علم کو جو سلسلہ تعلیم سے وابستہ تھے' مالی امداد دی البتہ جو علماء اور شیوخ بادشاہوں سے قریب ہوتے وہ شاہی عطیوں سے نوازے جاتے اور جو لوگ قصر سلطانی سے دور رہتے' ان کے پاس فقر و قناعت' علم و ادب اور غم پنہاں کے سوا کوئی سرمایہ نہ ہوتا۔ اساتذہ عمومی طور پر رضائے الٰہی کے لیے پڑھاتے' خاص طور پر علوم دینیہ' البتہ بعض حالات میں استاد معاوضہ بھی لے لیتا۔ مشہور نحوی زجاج نے لکھا ہے کہ اسے نحو پڑھنے کا شوق تھا' انہوں نے فن نحو کے امام مبرد کا دامن تھامنا چاہا' لیکن مبرد مفت پڑھاتے نہیں تھے۔ مبرد کے سوال پر زجاج نے بتایا کہ وہ شیشہ گری کے پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر روز تقریباً ڈیڑھ درہم کما لیتے ہیں' وہ انہیں ہر روز ایک درہم نذر کرنے کے لیے تیار ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وقت ان کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرے۔ چنانچہ مبرد نے زجاج کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور نیک بخت شاگرد نہ صرف پابندی سے ایک درہم استاد کی نذر کرتا رہا بلکہ ان کی خدمت بھی کرتا رہا۔ ایک دن بنی مازنہ کے ایک آدمی نے مبرد سے درخواست کی کہ انہیں اپنے بچوں کے لیے نحوی استاد کی ضرورت ہے' زجاج کی التماس پر مبرد نے اس کا نام دے دیا' چنانچہ زجاج ایک ماہر فن کی حیثیت سے اس آدمی کے ہمراہ چلا گیا' لیکن مبرد کو برابر تیس درہم ماہوار بھیجتا رہا' اور اگر جیب اجازت دیتی تو اضافہ بھی کر دیتا۔ (۵)

مساجد میں درس و تدریس کے حلقے ایک طویل مدت تک اپنا کام کرتے رہے' نماز کے بعد تدریس کا آغاز ہوتا جو قرآن مجید کی تلاوت اور رسول اکرمؐ پر درود و صلوٰۃ سے شروع ہوتا لیکن ایک مدت کے بعد استاد' بسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ الرحمن الرحیم' سے اپنا لیکچر شروع کرتا۔ یہ رسم یعنی بسم اللہ سے لیکچر کا آغاز آج بھی جامع ازہریا دوسرے علمی اداروں میں جاری ہے۔ یہاں پر اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مسجد کے ساتھ ساتھ خلفاء اور سلاطین مختلف فنون کے ماہرین کا اجلاس بلاتے' جن میں علمی مسائل پر بڑی آزادی سے بحث ہوتی جو فکر و نظر کے لیے سودمند ہوتی اور ادراک حقیقت کے لیے مفید' مامون الرشید کا دربار اس قسم کے علمی مباحث کے لیے شہرہ آفاق تھا' صحیح بات تو یہ ہے کہ گزشتہ تیرہ سو سال میں مسلم دنیا مامون الرشید جیسا بلند نظر' اولوالعزم اور جلیل القدر عالم حکمران پیدا نہ کر سکی۔

مساجد میں پڑھانے کا طریقہ سادہ اور فطری تھا' یعنی زبانی تھا' استاد کسی موضوع پر تفسیر یا حدیث پر زبانی تقریر کرتا' طالب علم اسے یاد کر لیتے' خاص طور پر حدیث کو جسے طالب علموں کی سہولت کے لیے تین بار دہرایا جاتا تاکہ آسانی سے یاد ہو سکے لیکن ایک وقت کے بعد یہ طریقہ (تلقین) املا میں بدل گیا یعنی ہر فن کا استاد جو اپنے موضوع پر پوری طرح سے تیار ہو کر آتا لیکچر دیتا اور طالب علم نوٹ لیتے جاتے جو بعد میں کتابی صورت میں بھی جمع کر دیے جاتے' ابو علی قالی اور سید مرتضیٰ کے معروف 'امالی' دراصل یہی لیکچر ہیں۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک چلتا رہا' بڑے بڑے ائمہ فن اپنے موضوع پر خوب خوب داد تحقیق دیتے رہے' لیکن جب طالب علموں کے لیے کتابوں کا حصول کسی قدر آسان ہو گیا تو تدریس کتابی صورت اختیار کر گئی اب استاد لیکچر کی بجائے کتاب پر اعتماد کرتا' طالب علم کتاب پڑھتا جاتا' استاد مشکل مقامات کی شرح کرتا جاتا اور کسی جگہ اگر کوئی اشکال ہوتا تو شاگرد کے سوال پر اسے رفع کر دیتا' ایک وقت کے بعد [illegible]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند کتابوں کے علم اور نفس علم کے حصول میں بڑا فرق ہے۔ (٦) یہی زمانہ علمی انحطاط کا زمانہ تھا جس میں تعلیم، مساجد سے سرکاری مدارس میں منتقل ہو گئی تھی۔ عباسی عہد کے دور ثانی میں مساجد کے ساتھ ساتھ مدارس کی علیحدہ اور مستقل عمارتیں بھی وجود میں آگئیں، بڑے بڑے امراء اور اعیان حکومت کی حویلیوں میں بھی درس و تدریس کے حلقے قائم ہو گئے، صوفیائے کرام کی خانقاہوں حتی کہ تاریخی مقابر سے، مثلاً دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ، بھی مدارس کا کام لیا جانے لگا۔ حکومت کی طرف سے عموما مساجد اور مدارس کے لیے جاگیریں وقف ہوتیں، تاکہ طلبہ اور اساتذہ دل جمعی سے اپنے کام میں مشغول رہیں، بڑے بڑے امراء علمی حلقوں کی سرپرستی کرتے اور مدارس کے قیام کو اپنے لیے ایک اعزاز جانتے، جیسے کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ مسجد میں درس و تدریس کے حلقے اپنی قلمرو میں پوری طرح آزاد تھے، ان کی فکری و علمی آزادی پر کوئی پابندی نہ تھی، اسی آزادی فکر کا کرشمہ تھا کہ مذہب، فلسفہ، اخلاق، تصوف، قانون، ادب اور سائنس میں مسلم فکر نے اپنے جوہر دکھائے، جس سے علم و حکمت کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا، اور انسانی تہذیب و اخلاق کا چہرہ دمک اٹھا۔

پہلے اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ بغداد، اصفہان اور شیراز میں سرکاری مدارس کے قیام پر علمائے ماوراء النہر نے اپنے قلق و اضطراب کا اظہار کیا تھا، لیکن اس واقعہ سے قبل مصر میں فاطمی حکومت تعلیم کو اپنی تحویل میں لینے کا قدم اٹھا چکی تھی، مصر میں جامع ازہر پہلی مسجد ہے جسے سرکاری طور پر حکمرانوں نے اپنے مذہبی اور سیاسی عقائد کی اشاعت کے لیے استعمال کیا، اس سے پہلے مصر کی تاریخی مساجد میں (مثلاً جامع مصر جو جامع عمرو بن عاص کے نام سے معروف ہے) علمی حلقے جمتے تھے، لیکن وہ حکومت کے نقیب نہیں تھے۔ امام شافعی جیسا بلند پایہ عالم اسی مسجد میں اپنی زندگی کے آخری سانس تک درس دیتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا اور مختلف موضوعات پر طلباء کے لیے روشنی کا مینار بنا رہا، لیکن وہ اپنے فکر و نظر میں پوری طرح سے آزاد تھے، البتہ حکومت وقت نے بھی ان پر اپنا نقطۂ نظر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی، جس کی وجہ سے دانش گاہوں کی علمی فضا برقرار رہی لیکن جامع ازہر پر سرکاری تسلط سے فکری آزادی کو نقصان پہنچا، ایک دفعہ ایک آدمی کو صرف اس جرم میں کوڑے لگوا دیئے گئے کہ اس کے پاس امام مالک کی مشہور تصنیف "موطا" تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ سرکاری مدارس کے قیام پر علمائے حق نے صف ماتم بچھائی تھی۔ افسوس! کہ فکری آزادی کو کچلنے کی یہ رسم مسلم حکمرانوں کو پسند آگئی، چنانچہ جب فاطمی کھنڈروں پر ایوبی عمارت اٹھائی گئی تو اس نے مصر میں اور موحدین نے اندلس میں اشعری عقائد کو بزور پھیلایا اور اس سلسلہ میں بقول مقریزی "بیشمار لوگوں کو قتل کیا گیا جن کی تعداد بجز خدا کوئی نہیں جانتا۔" (۷)

مسلم دنیا میں پہلا مدرسہ کب قائم ہوا؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، مقریزی نے لکھا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں مدارس کا قیام چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے بعد عمل میں آیا، اس سے قبل صحابہ کرامؓ یا تابعین رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ان کا وجود نہ تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلا مدرسہ اہل نیشاپور نے بیہقیہ کے نام سے قائم کیا، ابن خلکان نے ابن فورک کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ اہل نیشاپور کی دعوت پر نیشاپور آئے جہاں ان کے لیے مدرسہ اور گھر بنایا گیا۔ ابن فورک کا انتقال ۴۰۶ ھ میں ہوا، مقریزی نے مدارس کے ذکر میں جہاں یہ لکھا کہ ان کا قیام چوتھی صدی ہجری کے بعد عمل میں آیا وہاں ایک دوسری جگہ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ قاہرہ میں حاکم بامراللہ کی قائم کردہ علمی اکیڈمی یا دارالحکمۃ ایک عظیم الشان علمی ادارہ تھا، جس میں لوگ مطالعہ کے لیے آتے تھے اور بعض لوگ پڑھنے کی نیت سے، ان کے لیے درس و تدریس کی آسانیاں مہیا کی گئی تھیں۔ مثلاً کاغذ، قلم، دوات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ۔ حاکم نے یہ ادارہ ۳۹۵ھ (۱۰۰۵ء) میں قائم کیا تھا' یعنی جامع ازہر کی تاسیس سے ۳۵ سال بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا' جس میں قرآن' فقہ' عربی زبان' فلکیات' طب' ریاضی' نجوم غرضیکہ کئی علوم کے شعبے قائم کئے گئے اور ماہرین فن کا تقرر کیا گیا۔ اس ادارے کا قیام چوتھی صدی کے بعد نہیں بلکہ چوتھی صدی کے اندر ہی واقع ہوا ہے اس لیے یہ کہنا کہ مدارس کا قیام چوتھی صدی ہجری کے بعد عمل میں آیا ہے' شاید صحیح نہ ہو البتہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بغداد میں نظام الملک طوسی کی قائم کردہ دانش گاہ نظامیہ پہلی سرکاری درس گاہ نہیں تھی' اس سے بہت پہلے سرکاری مدارس وجود میں آچکے تھے' غزنی میں سلطان محمود نے تقریباً ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ بقول فرشتہ "دراصل ایک مسجد کے ساتھ ملحق تھا جس میں نفیس اور قیمتی کتابیں تھیں' مسجد و مدرسہ کے لیے بہت سے گاؤں وقف تھے..... سلطان کی پیروی میں اس کے امراء اور اعیان حکومت نے بھی مسجدیں' مدارس' سرائیں اور خانقاہیں بنوائیں۔" (۸) محمود کا بیٹا مسعود ایک علم دوست حکمران تھا' البیرونی جیسی یگانہ روزگار شخصیت اسکے دربار سے وابستہ تھی' اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لاہور کی مساجد میں بھی جو غزنوی قلمرو کا ایک حصہ بن چکا تھا' درس و تدریس کے حلقے سرگرم عمل رہے ہوں گے' رہا یہ سوال کہ برصغیر میں مدارس کا قیام کب عمل میں آیا؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ اگر شہاب الدین غوری کو ہندوستان میں مدارس کے قیام کا بانی کہا جائے۔ تو شاید یہ دعوئ صحیح ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ غوری نے اجمیر پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے بت کدوں کو بقول تاج المآثر گرا دیا اور ان کی جگہ مساجد اور مدارس کو تعمیر کرایا۔ (۹) گویا مسلم ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلے مدارس تھے جو شہاب الدین کے ہاتھوں قائم ہوئے' ہرچند غوری رزم کا آدمی تھا لیکن بوقت فرصت وہ ترک غلاموں کو پڑھایا کرتا تھا' یہی ترک غلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، جن کے ہاتھوں ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ غوری کے انہی تربیت یافتہ غلاموں میں ایک ناصرالدین قباچہ تھا، جو غوری کا داماد تھا اور اوچ شریف (بہاولپور ڈویژن) کا والی، غوری کی وفات کے بعد اس نے ملتان اور سندھ کے بعض علاقے بھی زیر نگیں کر لیے تھے۔ اوچ میں مدرسہ فیروزی کا پتہ چلتا ہے۔ قباچہ نے بقول طبقات ناصری، قاضی منہاج سراج کو ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ء) میں اس کا ناظم مقرر کیا تھا۔ (۱۰) غوری کے ایک دوسرے نامور غلام قطب الدین ایبک نے بنارس میں اپنے آقا کی رسم کو دہرایا۔ یعنی بقول تاج الماثر یہاں کے بتکدوں کو ڈھا کران کی جگہ مدارس اور مساجد کو قائم کیا۔ (۱۱) قطب الدین ایبک کے بعد التمش نے جو علماء اور مشائخ سے عقیدت رکھتا تھا، دہلی میں مدرسہ معزالدین قائم کیا۔ جو جامع مسجد کے قریب تھا، طبقات ناصری نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ قرامطہ کا ایک مسلح گروہ جامع مسجد پر حملہ آور ہوا، اس گروہ کا ایک حصہ جامع مسجد جاتے ہوئے بازار بزازاں سے گزر کر مدرسہ معزیہ کے دروازے میں اسے جامع مسجد سمجھ کر داخل ہوا۔ (۱۲) اس سے پتہ چلتا ہے کہ مدرسہ جامع مسجد کے قریب تھا۔ یہی مدرسہ معزالدین ہے جس کی ویراں اور شکستہ عمارت کو فیروز شاہ تغلق نے از سر نو تعمیر کروایا اور اسے اپنے کارناموں میں شمار کیا، التمش کی وفات کے بعد اس کی نامور بیٹی حکمران بنی، جس نے اپنے والد کی روایات کو زندہ رکھا، رضیہ نے ۶۳۵ھ (۱۲۳۷ء) میں قاضی منہاج کو دہلی میں مدرسہ ناصریہ کا منتظم مقرر کیا، (۱۳) غرضیکہ التمش کے بعد ہر آنے والے حکمران نے مدارس کے قیام کو ضروری جانا، اور ملک کے مختلف مقامات پر مدارس قائم کئے جو برابر ترقی کرتے رہے یہاں پر چند مدارس کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی آمد کے آغاز ہی میں مسجد اور مدرسہ کے قیام کو ضروری جانا۔ یہاں پر یہ بات محتاج بیان نہیں کہ ان مدارس میں بنیادی طور پر قرآن، سنت، فقہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان سے متعلقہ علوم کی تعلیم دی جاتی تھی' فیروز شاہ تغلق کے قائم کردہ مدرسہ میں مولانا جلال الدین رومی' تفسیر' حدیث اور فقہ کا درس دیتے تھے' شہزادوں کو گھر پر فارسی زبان کی کلاسیکی شاعری اور فن سیاست کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ سلطان بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کے مصاحب' شہزادے کو بہ قول ضیاء الدین برنی' دیوان سنائی' دیوان خاقانی' خمسہ نظامی اور شاہ نامہ (فردوسی) پڑھاتے تھے' مزید یہ کہ شہزادوں نے بلبن کے حکم پر تاج الدین بخاری سے "آداب سلاطین" پڑھی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں خاندان غلاماں سے لے کر لودھی عہد تک مدارس میں مندرجہ ذیل مضامین اور کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ (۱۴)

۱۔ تفسیر:　کشاف' مدارک' بیضاوی

۲۔ حدیث:　مشارق الانوار' مصابیح السنة

۳۔ فقہ:　مجمع البحرین' قدوری' ہدایہ

۴۔ اصول فقہ:　حسامی' المنار' اصول بزدوی

۵۔ ادب:　مقامات حریری

۶۔ منطق:　شرح شمسیہ

۷۔ کلام:　شرح صحائف' عقیدہ نسفیہ

۸۔ تصوف:　التعرف' عوارف المعارف' نقد النصوص

ہم نے پہلے کہا ہے کہ خانقاہ بھی علم و تربیت کی ایک اہم درس گاہ رہی ہے' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء اور ان کے بلند پایہ شیوخ کی اخلاقی تربیت سے اہل شہر کا رجحان راستی اور حق پرستی کی طرف تھا' اہل قلم اور امراء اخلاق و تصوف کی کتابوں کے دلدادہ تھے' برنی نے اپنی تاریخ میں شیخ نظام الدین اولیاء کے ترجمہ میں مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے: رسالہ قشیریہ' قوت القلوب' احیاء علوم الدین' شرح تعرف'

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرصاد العباد، کشف المحجوب، مکتوبات عین القضاۃ، قاضی حمید الدین کی لوائح ولوامع، خواجہ حسن کی فوائد الفواد۔ سوسائٹی میں ادب عالیہ کی ان کتابوں کے فروغ سے سوسائٹی کے عمومی مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مشائخ چشت قرآن مجید کی تلاوت، تفسیر اور مطالعہ کا خاص اہتمام کرتے تھے، ہرچند دربار کی زبان فارسی تھی، اعیان حکومت اور امرائے شہر فارسی ہی میں گفت گو کرتے تھے، لیکن مسلم ثقافت میں عربی زبان بنیادی کردار ادا کر رہی تھی، کیونکہ مدارس میں اعلی تعلیم اسی زبان میں دی جاتی تھی، بے شبہ عربی یہاں کی قومی زبان یا یہاں کے عوام کی زبان نہیں تھی، لیکن دانشوروں کو مذہبی اور اخلاقی فکر و نظر کا سرو سامان، یہی زبان فراہم کرتی تھی، فارسی زبان کی نزاکت و لطافت اور ہندوستان کی قدیم فلسفیانہ روایات کی عظمت سے مجال انکار نہیں، لیکن مسلم ہندوستان کی مذہبی زبان وہی تھی جو مدارس میں پڑھائی جارہی تھی۔ البتہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ عربی زبان عوام کی نہیں خواص کی زبان تھی، اس لیے تعلیم کا دائرہ یقیناً وسیع نہیں تھا۔ آبادی کا ایک کثیر حصہ تعلیم سے محروم رہتا ہوگا۔ البتہ ابتدائی تعلیم کا دائرہ (مکتب) وسیع تھا، جو گاؤں گاؤں تک پھیل گیا تھا، جس میں قرآن خوانی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اعلی تعلیم کے لیے مدارس تھے، جو عموماً بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جاتے، اب مدارس میں پڑھائے جانے والے نصاب میں منقولات کا پلہ بھاری تھا، خاص کر فقہ و دینیات کا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ قاضی اور مفتی کے لیے کہ سرکاری منصب تھے، فقہی کتابوں کے متون بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ نصاب میں حدیث کو کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ غیاث الدین تغلق کے دربار میں شیخ نظام الدین اولیاء اور علمائے دربار کے درمیان مسئلہ سماع پر مذاکرہ ہوا۔ حضرت شیخ نے سماع کے جواز پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استدلال کیا' تو علماء نے کہ سماع کی حرمت کے قائل تھے' حدیث کی بجائے فقہی روایت کا مطالبہ کیا۔ شیخ نے جواب میں کہا: سبحان اللہ! میں حدیث مصطفویؐ بیان کر رہا ہوں اور تم مجھ سے فقہی روایت کا مطالبہ کر رہے ہو۔ (۱۵)

یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ علمائے دربار نے حدیث کے بارے میں جو موقف اختیار کیا' قرآن و حدیث کے بارے میں یہی موقف علمائے اندلس نے اختیار کیا تھا' عبدالواحد المراکشی اپنی تاریخ المعجب میں لکھتے ہیں:۔

"بادشاہ (وقت) سے قریب ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا امام مالک کے مذہب کے احکام کا علم' چنانچہ مالکی مسلک کی کتابوں اور ان کے احکام کو اس عہد میں بڑا فروغ اصل ہوا۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو پس پشت ڈال دیا گیا' حتی کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس عہد کے مشاہیر میں سے ایک عالم بھی ایسا نہیں تھا جس نے پوری طرح کتاب و سنت کی طرف رخ کیا ہو۔ چنانچہ جس کسی نے علم کلام میں دلچسپی لی وہ کافر قرار دیا گیا' علم کلام کی شناعت و قباحت' علمائے سلف کا علم کلام کو برا جاننا اور اس علم سے دلچسپی رکھنے والے سے اپنی براءت کا اظہار نیز یہ کہ علم کلام' دین میں ایک بدعت ہے' اس سے عقائد میں فتور واقع ہوتا ہے۔ غرضیکہ ان تمام امور کے بارے میں فقہاء نے بادشاہ کے پاس بیٹھ کر فیصلہ کیا' اور بادشاہ کے دل میں علم کلام اور اہل کلام سے نفرت مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ تھا کہ جب ابو حامد غزالی کی کتابیں مغرب پہنچیں تو امیر نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو جلانے کا حکم دے دیا اور کہا کہ جس آدمی کے پاس غزالی کی کوئی کتاب برآمد ہوئی اسے جان و مال سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔" (۱۶)

ایسے ہی نصاب تعلیم میں فلسفہ و حکمت کو بھی کوئی مقام حاصل نہیں تھا، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ علماء کو فلسفہ سے ایک گونہ وحشت و نفرت تھی۔ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں سلطان بلبن کے ذکر میں لکھا ہے کہ سید نورالدین غزنوی نے سلطان التمش کو یہ "قیمتی" مشورہ دیا تھا۔ "فلسفہ، علوم فلسفہ اور معقولات فلاسفہ پر اعتقاد رکھنے والوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیں، اور (ملک) میں علوم فلسفہ کی تعلیم کسی صورت میں بھی روا نہ رکھیں، اور بدمذہب، بد عقیدہ لوگوں اور اہل سنت کے مخالفوں کی تذلیل و توہین میں کوشش کرتے رہیں، اور کسی بے دین، زندیق (بد عقیدہ) اور بدمذہب کو اپنی حکومت کے پاس پھٹکنے نہ دیں۔" (۱۷) فلسفہ اور اہل فلسفہ کے بارے میں سید نور الدین غزنوی نے اپنے عہد کے عام ذہنی رجحان کی ترجمانی کی ہے۔ خود ضیاء الدین برنی کو فلسفہ سے سخت شکایت ہے، برنی نے سلطان محمد تغلق کی شخصیت کو مجموعہ اضداد قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ سلطان نے اپنی غیر معمولی خدا داد صلاحیتوں کے باوجود اہل علم اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا ہے، جس کی وجہ فلسفہ سے سلطان کی محبت ہے، جس نے سلطان کے قلب و نظر پر قبضہ جما رکھا ہے، فلسفہ سے ضیاء الدین کی شکایت صحیح ہو یا غلط، البتہ فلسفہ سے شدید نفرت کا ایک سبب شاید قرامطہ کی خوفناک سیاسی سرگرمیاں تھیں، جو بظاہر فلسفہ کا سہارا لیتی تھیں، لیکن بہ باطن خنجر کا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو نہ صرف کئی ممتاز علمی اور سیاسی شخصیتوں سے محروم ہونا پڑا، بلکہ بے گناہ عوام کو بھی بڑے دکھ اٹھانے پڑے۔ قرامطہ سے نفرت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ محمود غزنوی کے دربار میں ہر شریف آدمی کو جو عقل و دانش کی بات کرتا تھا، قرامطی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سمجھ لیا جاتا تھا اور بعض اوقات بیچارہ اپنا سر بھی کھو بیٹھتا تھا۔ غرضیکہ فلسفہ کو حدیث کی طرح نصاب تعلیم میں اس کا جائز مقام نہ مل سکا۔ یہ نصاب برسوں تک پڑھایا جاتا رہا۔ خاندان غلاماں کے بعد خلجی عہد میں بھی نصاب پرانی روش پر چلتا رہا، ہرچند علاء الدین کو علم و حکمت اور شریعت و اخلاق سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، لیکن اس کی کامیاب سیاسی پالیسی سے ملک کو امن و امان اور خوش حالی نصیب ہوئی، جس کی وجہ سے دہلی بہ قول برنی صحیح معنی میں علم و ادب کا مرکز بن گئی، یہاں پر ہر فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔ جس علم کو بھی لو، خواہ منقولات ہوں خواہ معقولات... ہر ایک میں یہ لوگ موشگافیاں کرتے تھے۔ تغلق دور میں حکمرانوں نے علم و حکمت سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا، محمد تغلق کو فلسفہ سے لگاؤ تھا۔ فیروز شاہ تغلق کو علم و حکمت سے محبت ورثہ میں ملی تھی۔ اس نے جہاں پرانے ویران مدارس کو آباد کیا۔ وہاں اس نے اپنے مدارس بھی قائم کئے۔ اس کا اپنا مدرسہ اپنی خوبصورتی اور دل آویزی میں دہلی میں ضرب المثل بن گیا تھا۔ ضیاء الدین برنی نے اس مدرسہ کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ علم و حکمت سے فیروز شاہ کی ذاتی دلچسپیوں سے دہلی کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ قلقشندی نے فیروز شاہی دہلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ (صرف دہلی میں) ایک ہزار مدارس تھے اور ستر ہسپتال۔" (۱۸) یہ بیان اگر مبالغہ سے خالی نہ ہو، تب بھی اس بات کا انکار کرنا مشکل ہے کہ مدارس برابر ترقی کر رہے تھے۔ ہندوستان میں فیروز شاہ شاید پہلا مسلم حکمران ہے جسے آثار قدیمہ اور دوسری تہذیبوں سے بھی دلچسپی تھی، اس نے عہد اشوک کے دو مناروں کو جو زمانہ کی دست برد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے، بجد سعی و مشقت اور انتہائی حزم و احتیاط سے میرٹھ اور خضر آباد سے دہلی منتقل کیا، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں منارے پانڈووں کے زمانہ سے کھڑے تھے، فیروز شاہ نے ایک منارے کو جامع مسجد کے قریب نصب کیا جو اب زریں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منارہ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرا کوشک شکار محل کے پاس' اور اس طرح سے انہیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردیا۔ (۱۹) ایسے ہی جب نگر کوٹ کے راجہ نے فیروز شاہ سے شکست کھائی تو فیروز شاہ کو پتہ چلا کہ نگر کوٹ کے ایک بت کدے میں ایک خوبصورت لائبریری ہے' جس میں ہندو علوم کی تیرہ سو کتابیں ہیں۔ فیروز شاہ نے اس لائبریری کو محفوظ رکھا اور چند ہندو علماء کو وہاں بھجوایا اور ان سے فلسفہ اور فال و شگون سے متعلق چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ ایسے ہی اپنے عہد کے ایک شاعر اعزالدین خالد سے اس لائبریری کی ایک کتاب کا' دلائل فیروز شاہ' کے نام سے ترجمہ کرایا۔ (۲۰) اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مسلم علماء' سنسکرت سے واقف تھے' اور ہندو سکالر' فارسی اور عربی زبان سے' فیروز شاہ کی انتظامیہ میں دو ہندو بڑے با اثر تھے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری منصب حاصل کرنے کے لیے فارسی سے آشنائی ضروری تھی' ہرچند فیروز شاہ' محمد تغلق کا سا انقلابی مزاج نہیں رکھتا تھا' لیکن اس کی علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں محمد تغلق کے فلسفیانہ ذوق کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں' مسلم بادشاہوں کے دربار میں فلسفہ کی آمد سے نصاب تعلیم کو اس کا خیر مقدم کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سکندر لودھی کے زمانہ میں ملتان کے دو بھائیوں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ دونوں بھائی ملتان کی علمی بربادی کے بعد دہلی آگئے جہاں بادشاہ نے انہیں خوش آمدید کہا' دونوں بھائی معقولات کا ذوق رکھتے تھے' اس لیے نصاب تعلیم میں معقولات کو جگہ ملی' ورنہ اب تک نصاب میں بہ قول غلام علی آزاد منطق و کلام میں شرح شمسیہ اور شرح صحائف کے سوا کوئی کتاب نہ تھی' سکندر لودھی' شیخ عبداللہ کے درس میں شریک ہوتا' چپکے سے آتا اور درس میں بیٹھ جاتا' درس کے بعد شیخ سے بات چیت ہوتی۔ اس عہد میں نصاب تعلیم میں مندرجہ ذیل کتابوں کا اضافہ ہوا:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عضد الدین ایجی کی مطالع و مواقف

میر سید شریف کی شرح مطالع و شرح مواقف

سکاکی کی مفتاح العلوم، تفتازانی کی مختصر المعانی، مطول، تلویح، شرح عقائد، صدر الشریف کی شرح وقایہ، مولانا جامی کی شرح کافیہ، جامی کی شرح کافیہ کے باوجود فن نحو میں لباب الالباب اور ارشاد کی تدریس مکمل طور پر موقوف نہیں ہوئی۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے کتاب الاخیار میں اپنی درسیات کے سلسلہ میں لباب الالباب اور ارشاد کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

سولہویں صدی میں جب لودھیوں نے مغلوں کے لیے ایوان اقتدار خالی کیا تو ہندوستان کی علمی و ادبی زندگی نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ ہر چند مغل خیبر کی راہ سے برصغیر میں داخل ہوئے تھے، لیکن ان کے فکر و نظر کی دنیا، دہلی سلطنت کی دنیا سے مختلف تھی، ان میں اسلام کے صدر اول کے عرب مسلمانوں کی سی اولوالعزمی، بلند نظری، روا داری، اور علم و ادب سے گہری شیفتگی پائی جاتی تھی، وہ مذہب کا بلند، پاکیزہ اور صحت مند تصور رکھتے تھے اور زندگی کی جمالیاتی قدروں کا گہرا شعور، چنانچہ انہوں نے یہاں کی علمی زندگی کو وقار بخشا، بے کیف اجتماعی زندگی کو معنویت اور حسن عطا کیا۔ مغل دراصل یہاں کی زندگی اور اس کے حسن وقبح پر گہری نظر رکھتے تھے، بابر کو نہ صرف یہاں کی گرمی، گرد و غبار اور تند و تیز ہواؤں سے شکایت ہے، بلکہ اسے لوگوں کی مردہ روحوں سے بھی شکوہ ہے، جو انسان کے جذبات و عواطف اور ذوق اخوت و صداقت سے عاری ہیں اور قوت تخلیق سے بے بہرہ، اہل ہند بابر کی نگاہ میں نہ صرف حسن سے محروم ہیں، بلکہ اچھے کھانوں، عمدہ پھلوں، نفیس گھوڑوں، آب خنک، حمامات اور مدارس سے بھی محروم ہیں۔ بابر جو بقول فرشتہ حنفی فقہ [illegible] تھا اور شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتا تھا، تلوار اور قلم دونوں کا دھنی تھا۔ تو زک بابری سے عیاں ہے کہ وہ یہاں کی اجتماعی اور علمی زندگی سے خوش نہیں تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے شبہ اس کے مشاہدات میں ابوریحان بیرونی کے علم و تجربہ کی سی گہرائی نہیں ہے' کیونکہ اسے اپنے چار سالہ قیام میں بقول جواہر لال نہرو یہاں کے پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا' اس کے قدم یہاں کے حسین خطوں سے ناآشنا رہے' لیکن جو لوگ ہندوستان کے قدیم فلسفہ حیات سے (جو زندگی کے اثبات پر نہیں نفی پر مبنی ہے) اور دہلی سلطنت کے تقلیدی مزاج سے واقف ہیں' وہ یہاں کی اجتماعی زندگی سے متعلق بابر کے مشاہدات کی تصدیق کریں گے ۲۲۔ بابر کے مشاہدات کی قدروقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے سنٹرل ایشیا کی علمی اور ثقافتی زندگی کا پیش نظر رہنا ضروری ہے جس میں بابر نے جنم لیا تھا۔ چنانچہ اپنی خاندانی' ثقافتی روایات اور جدید وطن کی اجتماعی زندگی سے آگہی کے بعد بابر اور اس کے جانشینوں نے ہندوستان کی پرانی بساط حیات کو درہم برہم کر دیا اور علم و حکمت اور فنون لطیفہ کی کشت ویراں کو آباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ بابر نے یہاں مختصر قیام کیا' اس کا سارا وقت جنگوں کی نذر ہو گیا' اس لیے اسے یہاں علمی اداروں کو قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ہرچند وہ یہاں سنگ و خشت کی عمارت' مدرسہ کے نام سے قائم نہ کر سکا' جس میں حروف شناسی کا نام آج کل علم رکھ دیا گیا ہے۔ اگر اسے کشائش تیغ و سناں سے فرصت مل جاتی تو وہ یقیناً اہل علم سے مشورہ کر کے ایسے ادارے قائم کرتا جو یقیناً ان افکار کی ترجمانی کرتے' جن کا اظہار اس نے ہمایوں کے نام اپنی معروف وصیت میں کیا ہے' اس وصیت سے اس کے تدبر' سیاسی بصیرت اور خداداد صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے' وہ لکھتے ہیں:۔

"فرزند من! ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالٰی کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے' اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۔ تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو' اور لوگوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

۲۔ گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرو تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریے کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔

۳۔ تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہیے اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہیے' تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں اور ملک میں امن و امان رہے۔

۴۔ اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی۔

۵۔ شیعہ سنی اختلاف کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو کیوں کہ اس سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔

۶۔ اپنی رعیت کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔(۲۳)

بابر کے بعد ہمایوں جسے سیاسی نشیب و فراز نے ٹک کر علمی کام کرنے کا موقع نہیں دیا' ریاضی' نجوم کا ماہر تھا اور کتابوں کا دلدادہ' حتی کہ میدان جنگ میں بھی کتابیں اس کے ساتھ رہتیں' اور عجیب اتفاق ہے کہ لائبریری ہی میں اس نے جان' جان آفریں کے سپرد کی' اس لیے اسے بھی یہاں کی علمی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کا موقع نہ ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نصاب تعلیم کو بہتر اور منظم کرنے کے لیے قدرت نے اکبر کو چن لیا تھا۔ اکبر نے اعلی تعلیم کے لیے نامور اساتذہ کی تلاش اور پھر ان کی دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے بچوں کی تعلیم کے لیے ہدایات جاری کیں' جن کی رو سے ہر بچہ سب سے پہلے حروف تہجی اور ان کی مختلف شکلوں کو لکھنا سیکھتا' دو دن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حروف اور ان کی صورتوں کا نام سیکھتا' ایسے ہی لفظوں کا جوڑنا' ایک ہفتہ کی مشق کے بعد وہ نثر یا نظم کے کسی قطعے کو جو اخلاقی ہوتا یا خدا کی حمد پر مشتمل' یاد کرتا۔ بچے عموماً استاد کی مدد کے بغیر ہی پڑھنے کی کوشش کرتے' جب وہ روانی سے پڑھنا شروع کر دیتے' تو ہر استاد انہیں روزانہ کا کام دیتا' ان کے نصاب میں جسے وہ مرحلہ وار پڑھتے' اخلاق' حساب' جیومیٹری' زراعت' فلکیات' طب' منطق' تدبیر منزل' آئین سلطنت' نیچرل فلاسفی' ریاضی' الٰہیات' تاریخ کے مضامین شامل ہوتے۔ بچوں کی تعلیم سے متعلق اکبر کی ہدایت پر ابوالفضل لکھتے ہیں کہ ان سے مدارس کو نئی زندگی ملی' تعلیم سے متعلق اکبری فرمان کا آخری جملہ جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے' یہ تھا کہ کسی کو وقت کے تقاضوں سے تغافل برتنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ یہ فرمان بتاتا ہے کہ اکبری شعوری طور پر روح عصر سے واقف تھا۔ نصاب تعلیم میں سنسکرت کی مندرجہ ذیل کتابیں مقرر کی گئیں۔

ویاکرانا (BAYAKARAN)

ویدانتا (NIYA-I-BEDANTA)

پتانجلی (PATANJAL) (۲۴)

نصاب تعلیم میں سنسکرت کی کتابوں کو داخل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم حکومت نہ صرف اپنے غیر مسلم ہندو شہریوں کی ادبی و ثقافتی میراث کی قدر کرتی ہے' بلکہ وہ مسلم شہریوں کو بھی اپنے وطن کی کلاسیکی روایات سے آگاہ دیکھنا چاہتی ہے۔ غرضیکہ نصاب کو وسیع اور صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے سے اکبری دور میں تعلیم کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ حصول علم میں ہندو اور مسلمان دونوں سرگرم عمل رہے۔ دونوں کو تعلیم کے میدان میں مساویانہ مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ مختلف علوم و فنون میں بعض ہندوؤں نے بڑا نام پیدا کیا' معقولات میں وہ استاد بھی مقرر کیے گئے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممتاز ہندو اہل علم کے نام دیئے ہیں۔ اس عہد میں سنسکرت سے فارسی میں تراجم کئے گئے، ان ترجمہ کرنے والوں میں ملا عبدالقادر بدایونی جیسے عالم دین اور مورخ بھی تھے، جنہیں اپنے مذہبی تقشف اور حمیت دینی کا بڑا دعوی تھا۔ آئین آموزش، سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت زبان ایک مضمون کی حیثیت سے مدارس میں داخل نصاب تھی، عہد اکبری سے قبل وہ یقیناً انفرادی طور پر پڑھائی جاتی ہو گی۔ ایسے ہی طب کا مضمون تھا، کہ علماء اس کی تحصیل کرتے۔ موسیقی اور مصوری سے اکبر و جہانگیر کی دلچسپیاں اور ان کی قدر شناسیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن کیا ان کی تعلیم و تدریس کے لیے بھی مروجہ نصاب تعلیم کے علاوہ کوئی علمی سرکاری ادارہ قائم تھا؟ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ موسیقی ایک زمانہ میں بہ قول شبلی درس نظامی کا ایک حصہ رہی ہے۔ لیکن کیا عہد اکبری میں بھی یہ دونوں مضمون نصاب تعلیم میں داخل تھے۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ بہرنوع اکبر نے فتح پور، دہلی اور آگرہ میں مدارس قائم کئے، موخرالذکر کو ایک علمی مرکز کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہ اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے دربار میں ہر فن کے یگانہ روزگار لوگ یکجا ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض ایک ہی وقت میں قلم اور تلوار کے دھنی تھے۔ انہی میں سے ایک فتح اللہ شیرازی تھے، جو علم کے مختلف شعبوں پر عبور رکھتا تھا، چنانچہ کبھی وہ ہمیں کندھے پہ بندوق اٹھائے اکبر کے ہمرکاب نظر آتا ہے اور کبھی بزم علم میں الہیات، فلسفہ اور ریاضیات پر داد تحقیق دے رہا ہے۔ وہ امرائے دربار کے بچوں کو بھی پڑھاتا تھا اور فلسفہ کی کلاسیکی کتابوں پر حاشیے بھی رقم کرتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہوا سے چلنے والی چکی، آئینہ حیرت' اا فائر کرنے والی بندوق بھی بنائی تھی' لطف یہ کہ تیغ و قلم کے ہنگاموں میں وہ قلب و روح کے بلند تقاضوں سے بھی بے خبر نہیں رہا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے دیوان خانے میں جہاں بہ قول بدایونی کوئی نماز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پڑھنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا' شیرازی پورے اطمینان و سکون سے نماز پڑھتا تھا۔ اس نے اکبر سے عضد الملک کا خطاب پایا اور علم و حکمت کو آگے بڑھایا اس کی وجہ سے نصاب میں بقول غلام علی آزاد ایران کے علمائے متاخرین مثلاً محقق دوانی' صدر الدین شیرازی' غیاث الدین منصور' میرزا جان کی کتابوں کو جگہ ملی' اور ہندوستان میں منطق و فلسفہ نے ایک نیا رخ بدلا اور ہر طرف اس کا سکہ چلنے لگا۔ (۲۵) اسی بزم علم کی ایک دوسری شخصیت عبدالرحیم خان خاناں کی ہے جو اپنے علم و ادب' حکومتی نظم و ضبط' سپاہیانہ استقامت کی وجہ سے بادشاہوں کے لیے قابل رشک تھی' خان خاناں عربی' فارسی' ہندی اور سنسکرت کا فاضل تھا۔ اور جب ۱۵۸۰ء میں اکبر کی دعوت پر گوا سے عیسائی وفد آیا تو اکبر کے حکم پر اس نے اس وفد سے لاطینی اور پرتگیزی زبانیں سیکھنا شروع کیں۔ خان خاناں کی علمی سرگرمیاں اس کے سپاہیانہ ولولوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں' کہتے ہیں کہ احمد نگر کی ایک مہم میں اس کی فوج کے ایک کمانڈر دولت خان نے دشمن کی غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر عبدالرحیم سے پوچھا کہ اگر کل کو کچھ ہو گیا تو آپ کو کہاں تلاش کریں؟ لاشوں کے نیچے' خان خاناں نے جواب میں کہا۔ مدارس کے قیام اور علمائے وقت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر نے ایک نادر لائبریری بھی قائم کی۔ ایسی نادر لائبریری بقول سمتھ اکبر سے پہلے کبھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ بادشاہ کو خوبصورت قلمی کتابوں کا شوق تھا۔ بعض اوقات علمی شخصیتوں کے علمی ذخیرے بھی شاہی لائبریری میں منتقل ہو جاتے' کہا جاتا ہے کہ فیضی کی موت پر اس کی قیمتی لائبریری' جس میں چار ہزار چھ سو قلمی کتابیں تھیں۔(۲۶) شاہی لائبریری کا حصہ بنی' غرضیکہ اکبر نے علم و حکمت کی اشاعت کے لئے مقدور بھر کام کیا' یہ اکبر کا ذوق تجسّس تھا' جس نے اسے زندگی بھر آرام سے بیٹھنے نہیں دیا۔ اکبر کا یہی جذبہ تھا جس نے گوا سے عیسائی وفد کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی' اکبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراصل اس نئی بحری طاقت کے، جس کی اجازت کے بغیر اکبری دربار کے بڑے بڑے امراء اور شیوخ حج کی سعادت نہیں حاصل کر سکتے تھے، طرز فکر اور فلسفہ حیات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کی علمی سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا چاہتا تھا اور علم و حکمت کے فروغ کے لیے صاف ذہن رکھتا تھا۔ جس میں کوئی الجھاؤ یا ژولیدگی نہیں تھی۔ ہرچند تلاش حق میں اکبر کے قدم بعض اوقات صحیح سمت میں نہیں اٹھے، لیکن مختلف مذاہب کے درمیان مکالمات کے لیے زمین ہموار کرنا، تحصیل علم کے لیے رعایا کے سب طبقوں کو مساویانہ مواقع عطا کرنا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصاب تعلیم کی تشکیل میں وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا۔ (۲۷) اکبر کے ایسے کارنامے ہیں جن پر ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ اس کے سامنے اپنا سر جھکاتی رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ وسطی ایشیا کی مسلم تہذیب نے اکبری دور میں ہندوستانی فکر کی روح میں ڈوب کر ایک نیا تجربہ کیا تھا۔ یہ تجربہ اکبر ہی کے دور میں ہو سکتا تھا، جس نے فرسودہ روایت کو توڑ کر صحت مند نئی روایات کی بنیاد رکھی اور تلاش حق کے لیے اس کی روح ہمیشہ بے قرار رہی۔

اکبر کے بعد جہانگیر نے تعلیم کو پھیلانے کے لیے چند اقدامات کئے، جن میں ایک یہ تھا کہ اگر کوئی صاحب ثروت یا سیاح اپنے پیچھے کسی وارث کو چھوڑے بغیر مرجاتا تو اس کی جائیداد کو سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا اور اسے مدارس اور خانقاہوں کی تعمیر اور ان کی دیکھ بھال پر خرچ کیا جاتا۔ جہانگیر اپنے باپ دادا کی طرح علم دوست حکمران تھا، وہ ہر جمعہ کی شام کو علماء اور مشائخ سے ملتا، وہ ہندو درویشوں سے بھی ملنے جاتا۔ وہ اجین کے ایک درویش، جد روپ سے جو اپنی خلوت پسندی، سخت کوشی، پاک بازی اور فلسفہ ویدانت سے گہری شیفتگی کی بناء پر اپنے وقت کی منفرد شخصیت نظر آتا ہے۔ اس کی کھوہ میں ملنے کے لئے کئی میل تک پیدل چل کر گیا اس سے علمی بات چیت کی اور بہت متاثر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی بھی اسے ورثے میں ملی تھی' کہا جاتا ہے کہ سرطامس رونے جہانگیر کی خدمت میں ایک خوب صورت تصویر پیش کی جسے جہانگیر نے اپنے مصور کو دے دیا' چند دنوں کے بعد جہانگیر نے رو کو چند تصویریں دیں جن میں سے پانچ تصویریں شاہی مصور نے تیار کی تھیں۔ یہ تصویریں اصل سے اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ ان میں فرق کرنا مشکل تھا' انگریزی سفیر نے بڑی مشکل سے اصل تصویر کو جسے اس نے جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا تھا' پہچان لیا۔ رو کا بیان ہے کہ اسے یہ امید نہیں تھی کہ شاہی مصور اس خوبی و مہارت سے تصویریں بنا سکے گا۔

جہانگیر بابر کی طرح فطرت کا بڑا عاشق تھا' ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ بابر اپنے قیام ہند میں فرغانہ اور کابل کو برابر یاد کرتا رہا۔ یہاں کے موسم گرما سے کون خوش ہو سکتا ہے؟ اکبر موسم گرما میں کشمیر جایا کرتا تھا' جہانگیر نے اس رسم کو زندہ رکھا' اس نے سری نگر میں شالیمار کے نام سے ایک خوب صورت باغ بنوایا' جس کی خوب صورتی کو دو یا سہ آتشہ بنانے میں فطرت نے بڑا کردار ادا کیا۔ پہاڑی کی بلندی سے آبشاروں کے گرنے سے باغ' کشمیر جنت نشان میں طلسماتی جزیرہ بن گیا تھا' مغلوں نے چاہا کہ اس حسن کو پنجاب کے تپتے ہوئے میدانوں میں منتقل کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے لاہور میں اسی نام سے باغ بنوایا۔ یہاں باغ بنوانے کے لیے انہیں جن دشواریوں سے گزرنا پڑا' ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں' اس لیے کہ فطرت نے لاہور کو سری نگر کے سے حسن سے نہیں نوازا تھا' لیکن بادشاہ نے مصنوعی طریقوں سے کام لیا' پانی کے لیے نہر بنوائی گئی اور بلندی سے آبشاروں کو گرانے کا انتظام کیا گیا اور اس کے لیے انسانی وسائل کا سہارا لیا گیا' اور یوں اہل نظر کے لیے حسن و جمال کا ساماں فراہم کیا گیا۔ کہتے ہیں جب ایک مغل شہزادی نے شالیمار باغ میں ایک خوبصورت آبشار میں اپنے غم پنہاں کی آواز سنی تو کہا:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی؟
سر در نگوں فگندہ ز اندوہ کیستی!
آیا چہ درد بود کہ چوں ما تمام شب
سررا بر سنگ می زدی و می گریستی!

جہانگیر کو درختوں، اور پھولوں کی معلومات حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا اور پودوں کی کاشت کاری سے دلچسپی، اس نے ہندوستان کو نئے درختوں اور پودوں کا تحفہ دیا، جسے اس نے باہر سے درآمد کیا تھا۔ لاہور میں بادامی باغ کا کامیاب تجربہ اس نے کیا، یہ باغ باداموں کے درختوں سے بھرا پڑا تھا۔ (۲۸)

موسیقی سے اکبر و جہانگیر کی دل چسپیاں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہیں، انہوں نے صحرائی جانوروں کو رام کرنے کے لیے موسیقی سے کام لیا، تاکہ انہیں آسانی سے شکار کیا جا سکے۔

"انندرام مخلص نے مراۃ المصطلحات میں اس طریق شکار کی دلچسپ تفصیلات لکھی ہیں، وہ لکھتا ہے کہ جب شکار قمرغہ کا اہتمام کیا جاتا تھا تو یہ طائفے شکار گاہ میں بھیج دیئے جاتے تھے اور رقص و سرود شروع کر دیتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد آہستہ آہستہ چاروں طرف سے ہرن سر نکالنے لگتے اور پھر رقص و سرود کی محویت انہیں بالکل طائفے کے قریب پہنچا دیتی۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ شکار قمرغہ کا قصد کیا اور اسی رقص و سرود کا جال بچھایا، جب ہرنوں کے غول ہر طرف سے نکل کر سامنے آکھڑے ہوئے تو نورجہاں کی زبان پر بے اختیار امیر خسرو کا یہ شعر طاری ہو گیا۔

ہمہ آہوان صحرا سرخود نہادہ برکف
بہ امید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

شعر سن کر جہانگیر کی غیرت مردمی نے گوارا نہ کیا کہ شکار کے لیے ہاتھ اٹھائے، دل گرفتہ واپس آگیا۔" (۲۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہانگیر کے بعد شاہجہان باوجود فن تعمیر سے اپنے گہرے شغف کے، مدارس کے قیام سے غافل نہیں رہا۔ بلکہ اس کے جمالیاتی ذوق نے مسجد و مدرسہ کے ان ٹوٹ رشتہ کو بیان کرنے کے لیے خوب صورت اور پر شکوہ عمارتوں کا سہارا لیا، سٹیفن (STEPHEN) نے لکھا ہے کہ جب شاہجہان نے ۱۶۵۰ء میں دہلی میں جامع مسجد تعمیر کی، تو اس کی جنوبی جانب ایک مدرسہ بنوایا اور شمالی جانب شفاخانہ یہ دونوں عمارتیں (مدرسہ وشفاخانہ) ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے قبل ہی ویران ہو گئی تھیں۔ رہی سہی کسر ہنگامے نے پوری کر دی، جب ان کا نام و نشان تک مٹ گیا اور انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا گیا۔ (۳۰)
بے شبہ شاہجہان کے پاس بابر و اکبر کا دماغ اور توانائی نہیں تھی، لیکن پھر بھی اس کے ذوق لطیف نے اسلامی تہذیب و تمدن کے روحانی، علمی اور عسکری پہلوؤں کو بیان کرنے کے لیے دہلی کی جامع مسجد، شاہی مدرسہ اور لال قلعہ کی زبان مستعار لی اور انسان کو بتایا کہ یہی وہ بلند قدریں ہیں جو تحصیل علم کا منتہائے نظر ہیں۔ عالم گیر کے عہد میں فنون لطیفہ کی رونق ماند پڑ گئی، موسیقی اور مصوری کو شاہی دربار میں بار نہیں ملا، لیکن مسلمانوں کی تعلیم و تدریس کے لیے عالم گیر نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ عالم گیر نے اپنی پوری قلمرو میں طالب علموں کے لیے وظائف مقرر کیے، "میزان" پڑھنے والا ابتدائی طالب علم آٹھ آنے یومیہ وظیفہ پاتا۔ (۳۱) بادشاہ نے حنفی اسکول کے مطابق فقہ کی مستند کتاب مدون کرانے کے لیے نظام کی سرپرستی میں علماء کا ایک بورڈ قائم کیا۔ اس منصوبے کی تکمیل پر دو لاکھ روپے کی لاگت آئی۔ عالمگیر نے بہ قول کین

> "موت کی سزا موقوف کر دی، زراعت کی حوصلہ افزائی کی، بے شمار مکتب اور مدارس قائم کیے اور ایک منصوبے کے تحت سڑکیں اور پل بنوائے" (۳۲)

عالمگیر کی نجی زندگی میں زہد و تقشف، جفاکشی اور سادگی کو بڑا عمل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دخل تھا۔ فارسی اور عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس لیے احیاء علوم الدین، کیمیائے سعادت جیسی کتابیں زیر مطالعہ رہتیں، لیکن اس کے فقہی رجحان کی وجہ سے نصاب تعلیم میں فقہ کو امتیازی مقام حاصل رہا، ملا نظام الدین سہالوی فرنگی محل (وفات ۱۷۴۷ء) نے نصاب تعلیم مرتب کیا، ہر فن اور ہر موضوع کی کتابوں کا تعین کیا، یہ نصاب اس قدر مقبول ہوا کہ آج بھی برصغیر کے مذہبی مدارس میں رائج ہے، اس نصاب میں جو آج درس نظامی کے نام سے مشہور ہے، مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔

تفسیر: جلالین، بیضاوی (سورہ بقرہ)

حدیث: مشکاۃ المصابیح (تاکتاب الجمعہ)

فقہ: شرح وقایہ اولین، ہدایۃ اخیرین

اصول فقہ: نورالانوار، تلویح، مسلم الثبوت

کلام: شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی، میر زاہد، شرح مواقف (تابحث اور عامہ)

گرائمر: میزان، منشعب، صرف میر، پنج گنج، زبدہ، فصول اکبری، شافیہ ابن حاجب، نحو میر، شرح مائتہ عامل، ہدایت النحو، کافیہ، شرح جامی،

منطق: صغری، کبری، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم

فلسفہ: میبذی، صدرا، شرح ہدایۃ الحکمۃ، ملا جونپوری کی شمس بازغہ

ریاضی: خلاصہ الحساب، تحریر اقلیدس (مقالہ اول) تشریح الافلاک، رسالہ قوشجیتہ، شرح چغمینی (باب اول)

بلاغت: مختصر المعانی، مطول (ما انا قلت تک)

واقعہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم کی تشکیل نو کا کام ملا صاحب مرحوم کے والد ملا قطب الدین شہید نے شروع کیا تھا جو ملا نظام الدین کی وفات کے بعد بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاری رہا، چنانچہ نصاب میں مزید مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ مثلاً مناظرہ، اصول حدیث، ادب اور فرائض کے مضامین، چنانچہ ادب میں نفحہ الیمن، معلقات، دیوان حماسہ اور مقامات حریری جیسی کتابیں رکھی گئیں۔ گرائمر میں علم الصیغہ دستور المبتدی، منطق میں قال اقول، میزان منطق، ملاحسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، میرزاہد، ملا جلال، فرائض میں شریفیہ، مناظرہ میں رشیدیہ، اصول حدیث میں شرح نخبتہ الفکر اور حدیث میں بخاری، مسلم، موطا، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ کا اضافہ کیا گیا۔ ملا صاحب (رحمتہ اللہ علیہ) کی تواضع اور کسر نفسی کا یہ عالم تھا کہ اس نصاب میں انہوں نے اپنی کوئی ذاتی تصنیف شامل نہیں کی۔ ان کا اخلاص کامیاب رہا۔ یہ نصاب اس قدر مقبول ہوا کہ تقریباً ڈھائی سو سال سے آج تک یہ نصاب عربی مدارس میں رائج ہے۔ (۳۳)

بے شبہ درس نظامی سے دقت نظر پیدا ہوتی ہے اور طالب علم کی ذہنی صلاحیتوں میں پختگی، بشرطیکہ وہ اپنا علمی سفر جاری رکھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں بعض ضروری مضامین کا اضافہ نہ ہو سکا۔ مثلاً درس نظامی میں تاریخ کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ قرآن مجید، اس کا پیغام، تفاسیر کا ناقدانہ جائزہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، مکی، مدنی، دور میں پیغام رسالت کی تاریخ، فقہ، اس کا ارتقا، اسلامی قانون کی ترتیب و تدوین اور اجتماعی مسائل، فقہ اور جدید قانون کا مقارنہ، یا تقابل ادیان، خود برصغیر میں مسلمانوں کی آمد، خدمات، عروج اور زوال کی داستان غرضیکہ یہ سب امور اس نصاب سے خارج رہے، حتی کہ معقولات میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے، اس میں وقت نے کیا انقلاب بپا کر دیا ہے یا ارسطو کے افکار کس حد تک مسترد کیے جا چکے ہیں اور فلسفہ اب کس مقام پر ہے؟ یہ باتیں نصاب سے خارج رہیں۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فن تفسیر میں کشاف کی جگہ جلالین، بلاغت میں اسرار البلاغہ کی جگہ مختصر و مطول، عربی ادب میں مولفات جاحظ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جگہ مقامات حریری کا انتخاب کیا گیا' شاید اسی لیے کہا گیا کہ درس نظامی عربی زبان سے کسی قدر شناسائی' اور فقہی معلومات کا ذریعہ تو تھا' لیکن اس سے دینی امور میں کوئی مجتہدانہ بصیرت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ خود مسلم حکمران بھی اپنے عہد میں مروجہ نصاب کو دینی معلومات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ رہی یہ بات کہ ریاست کے نظم و نسق سے متعلق کوئی مضمون جو اولوالعزم حکمرانوں کے لیے آئین جہانبانی کا کام دیتا یا اجتماعی زندگی کے مسائل سے متعلق رکھتا۔ غرضیکہ ان امور کے لیے خود حکمران اس نصاب سے مطمئن نہیں تھے۔ بلبن کے بیٹوں کے ذکر میں ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب اس کے بیٹے خوش نویسی سے فارغ ہوئے' تو بلبن سے صرف و نحو کی تعلیم کے لیے اتالیق رکھنے کی درخواست کی گئی' بلبن نے جواب میں کہا کہ "پہلے استاد کو عزت و تکریم سے رخصت کر دیا جائے' لیکن کسی دوسرے استاد کی ضرورت نہیں کیوں کہ اب وہ کسی تجربہ کار' علم تاریخ کے ماہر بزرگ سے بچوں کو ریاستی امور کے لیے آداب السلاطین' اور ماثر السلاطین' کتابیں جو التمش کے بیٹوں کے لیے بغداد سے منگوائی گئی تھیں' پڑھائیں گے' نیز یہ کہ بچے پست ہمت' پست اخلاق اور بھکاری قسم کے اساتذہ سے دور رکھے جائیں۔ کیونکہ حکومت اور جہاں بانی کے لیے ان لوگوں کی تعلیم بیٹوں کے کام نہیں آئے گی۔ رہی نماز' روزہ اور وضو کے احکام کی بات جن کے جانے بغیر چارہ نہیں تو یہ احکام بچوں نے سیکھ لیے ہیں۔" چنانچہ بلبن کے بیٹوں نے آداب السلاطین' تاج الدین بخاری سے پڑھی۔ (۳۴) خود عالمگیر کے بارے میں برنیر نے لکھا ہے کہ جب اس کا استاد اپنے سابق شاگرد سے ملنے آیا تو عالمگیر نے اس سے کہا کہ آپ نے مجھے عربی زبان پڑھائی' جس سے شناسائی دس بارہ برس کی محنت کے بغیر نہیں ہوتی اور صرف و نحو اور ایسے فن کی تعلیم دی جو ایک قاضی کے لیے ضروری ہے لیکن آپ نے مجھے انسانی تاریخ سے آگاہ نہیں کیا' یہ نہیں بتایا کہ سلطنت کی بنیادیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیونکر مضبوط ہوتی ہیں اور اس کے عروج و زوال کی داستان کیا ہے؟ تاریخ تو ایک طرف! آپ نے خود ہمارے اسلاف کی تاریخ بھی ہمیں نہیں پڑھائی کہ انہوں نے کیوں کر فتوحات حاصل کیں اور نہ ہی یہ پڑھایا کہ بادشاہی کے کیا آداب ہیں؟ بادشاہ اور رعایا میں کیا تعلقات ہوتے ہیں؟ اس کے برعکس آپ نے لفظی اور مہمل بحثوں میں میری جوانی برباد کی' غرضیکہ زندگی کے حقیقی مسائل پر آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اگر آپ مجھے ایسا فلسفہ پڑھاتے جو ژولیدگی فکر کا موجب نہ بنتا' بلکہ یہ درس دیتا کہ انہی باتوں کو قبول کیا جائے' جو دلیل و برہان کی ترازو پر پوری اترتی ہیں یا انسانی نفس کو ایسے بلند اخلاقی فضائل سے آراستہ کرتا' جن پر دنیاوی انقلابات اثرانداز نہیں ہوتے۔ اگر آپ نے مجھے یہ پڑھایا ہوتا تو پھر آج میں آپ کی ایسی عزت کرتا کہ اسکندر نے بھی ارسطو کی ایسی عزت نہ کی ہوگی۔ (۳۵) بے شبہ برنیر کی روایت میں مبالغہ کی آمیزش ہو سکتی ہے' لیکن عالمگیر جیسے جفاکش اور ذہین حکمراں کی موت کے بعد حالات نے جو رخ اختیار کیا' اس نے تعلیم سے متعلق عالمگیر کے ان خیالات کی صحت پر مہر لگا دی' واقعہ یہ ہے کہ اکبر کے جانشین جہانگیر و شاہجہان اپنی پوری خوبیوں کے باوجود فکری اور عملی طور پر اکبر سے بہت پیچھے تھے۔ انہوں نے اکبر کے فلسفہ تعلیم کو آگے نہیں بڑھایا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ خود اکبر اور اس کے دانشمند وزراء اپنے فلسفہ تعلیم کی بنیادوں پر کوئی یونیورسٹی قائم نہ کر سکے' جو اپنے داخلی صحت مند عناصر اور ان کی طاقت پر اعتماد کر کے اپنا وظیفہ ادا کرتی رہتی اور آج مسلم دنیا میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا مقام حاصل کرتی۔ شاہجہان کے بعد عالم گیر اپنی ذہنی اور عملی صلاحیتوں میں اپنے باپ اور دادا سے کہیں آگے تھا مزید یہ کہ وہ تعلیم کے بارے میں جیسا کہ برنیر کی روایت سے پتہ چلتا ہے' اکبر کی طرح ایک واضح اور صاف نظریہ رکھتا تھا' لیکن وہ بوجوہ نصاب تعلیم میں صحت مند بنیادوں پر کوئی انقلاب نہ لا سکا' اس کی ساری توانائیاں دکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی فوجی مہموں نے جذب کرلیں اور زندگی بھر ایسے مسائل میں الجھا رہا، جن کو اس کے فلسفہ سیاست نے جنم دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ عالمگیر کی وفات سے بہت پہلے مسلم معاشرے میں علم کا مفہوم بدل چکا تھا، اس میں وہ پہلی سی وسعت و آفاقیت باقی نہیں رہی تھی، بعض مضامین مثلاً ہندسہ، طبیعیات، بے کار مضامین شمار ہونے لگے تھے، علم ہندسہ بقول شیخ احمد سرہندیؒ بے کار اور مہمل علم تھا۔ (۳۶) حالانکہ اسی علم ہندسہ اور حساب سے بقول ابن خلدون انسانی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور اس کے جذبہ صدق و صفا کو استحکام اور اسی ہندسہ کی بدولت استاذ احمد لاہوری نے برصغیر کو تاج محل اور لال قلعہ کا تحفہ دیا تھا، لیکن علم طبیعیات اسی فخر روزگار (ابن خلدون) کی رائے میں دینی و دنیاوی نقطہ نظر سے غیرضروری علم ہے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ (۳۷) غرضیکہ عہد حاضر کے آغاز میں جب یورپ علم کی دنیا میں قرون وسطیٰ کے بطلیموسی تصور کائنات سے نکل کر گیلیلو اور ان کے ہم نوا مفکرین کی علمی دنیا میں آنے کی سعی پیہم کر رہا تھا اور سیاست کی دنیا میں پارلیمنٹ، مطلق العنان بادشاہوں کے اختیارات پر پابندی لگا رہی تھی اور خودسر حکمرانوں کے سر قلم کر رہی تھی، مسلم دنیا نے نصاب تعلیم میں سائنس، فلسفہ، تاریخ اور روح عصر سے برابر تغافل برتا اور ادراک حقیقت کے لیے اس نے خود اپنی ہی روایات، غور و فکر اور آزاد تحقیق و ریسرچ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو نہ صرف اپنے علمی مقام سے نیچے اترنا پڑا، بلکہ سیاسی عظمت کو بھی خیرباد کہنا پڑا، یہ المیہ ہندوستان میں بھی دہرایا گیا۔ یہاں بھی لوگ بے روح نصاب تعلیم کو میکانکی طور پر رٹتے رٹاتے رہے، جس کا زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ علم کلام کی بوسیدہ ہڈیوں کو چبانا دل پسند مشغلہ رہا، اور منطق جیسا مضمون الفاظ کی تک بندی کا نام بن کر رہ گیا۔ محمد حسین آزاد، دربار اکبری میں عبدالقادر بدایونی کے حالات میں قاضی ابوالمعالی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حوالے سے ایک دلچسپ لطیفہ لکھتے ہیں:

"جب علم منطق توران میں پہنچا تو دیکھتے ہی لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے، مگر مصالحہ ایسا تیز لگا کہ فلسفی، فیلسوف ہوگئے جب کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی ہنسی کرتے اور کہتے "گدھا ہے گدھا" لوگ منع کرتے تو کہتے: ہم دلیل منطقی سے ثابت کرسکتے ہیں، دیکھو! ظاہر ہے کہ یہ (نیک بخت صاحب دل) لاحیوان ہے۔ اور حیوان عام ہے، انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں، تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے، وہ بھی نہیں، پھر گدھا نہیں تو کیا ہے؟" جب ایسی ایسی باتیں حد سے گزر گئیں، تو مشائخ صوفیہ نے فتویٰ لکھ کر عبداللہ خان کے سامنے پیش کیا اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہوگیا۔" واقعہ یہ ہے کہ ہمارا نصاب تعلیم عہد انحطاط کی پیداوار تھا اور بقول علامہ شبلی "جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اسی دن سے علم کا تنزل شروع ہوگیا۔"

چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ ہماری اجتماعی زندگی تازہ خون نہ ملنے سے دم توڑ گئی، اور حالات اس حد تک خراب ہوگئے کہ عالم گیر کی موت (۱۷۰۷ء) سے صرف تیس سال بعد مرہٹے دہلی کے دروازے پر آن پہنچے، مگر دہلی میں ان کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس زمانہ میں نادر شاہ جیسے طالع آزما سفاک نے دہلی کا رخ کیا اور بڑی بے رحمی سے دہلی اور اہل دہلی کو تاراج کیا اور دہلی سے جاتے وقت بے حساب مال غنیمت کے ساتھ ساتھ مغل لائبریری کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ جو مغل حکمرانوں، ہندوستانی دانشوروں اور مسلم مفکروں کی فکری عظمت کا نشان تھی اور فلسفہ حیات کی علامت، اور اگر کوئی علمی چیز بچ گئی، تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرہٹوں اور جاٹوں کی پیہم شورشوں اور ۱۸۵۷ء کے المیہ کی نذر ہوگئی۔ مسلم ہندوستان کو یہ برے دن محض اس لیے دیکھنے پڑے کہ ملک صحت مند اخلاقی و سیاسی قیادت سے محروم ہوگیا تھا' ظاہر ہے کہ ریاست کے انتظام و انصرام اور معاشرے کی تعمیرو اصلاح کے لیے صحت مند اخلاقی فلسفہ حیات اور تعلیمی نظام ہی معاشرے میں بنیادی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ بے شبہ عالم گیر کی وفات کے بعد ملک کی نازک ترین گھڑیوں میں مروجہ تعلیمی نصاب' تخلیقی رول ادا کرنے سے قاصر رہا اور درس نظامی صالح قیادت فراہم کرنے سے عاجز۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک سیاسی نظام کی کامیابی یا ناکامی کا تعلق فکری زندگی سے ہے۔ جونہی فکری اور اخلاقی زندگی روبہ زوال ہوتی ہے' سیاسی زندگی کی رونق بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ سقوط بغداد ہو یا سقوط دہلی' بیت المقدس کا المیہ ہو یا "ڈھاکہ کا سیاسی ڈرامہ" یہ سارے واقعات ایک ہی داستان حقیقت کی کڑیاں ہیں اور وہ ہے علمی اور اخلاقی انحطاط کے نتیجہ میں سیاسی انتشار' چنانچہ عالمگیر کے نالائق جان نشینوں کو ایک غیر ملکی منظم طاقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا' جو اپنی تہذیب' معاشرت اور ثقافت میں اہل ہند سے مختلف تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بنیادی طور پر ایک تجارتی کمپنی تھی۔ جس کا علم' مذہب اور اخلاق سے کوئی تعلق نہیں تھا' چنانچہ جونہی اٹھارویں صدی میں مغل انتظامیہ کی بدنظمی نے اسے آگے بڑھنے کا موقع دیا' اس نے آگے بڑھ کر سیاسی میدان پر قبضہ کر لیا۔ جس سے اسے یہاں لوٹ مار کرنے کے لیے کھلی چھٹی مل گئی۔ اس نے بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا' جس کی وجہ سے یہاں کے علمی ادارے برباد ہوگئے' اور مسلمان اقتصادی طور پر اس قدر تباہ ہوئے کہ مدارس کی علمی سرپرستی ایک قصہ پارینہ بن گئی۔ چنانچہ کمپنی نے اپنے اقتصادی مفاد کو بچانے کے لیے ملک کی تعلیمی رفتار پر متعدد رپورٹیں لکھوائیں۔ ان رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان جو حصول علم میں سب سے آگے آگے تھے' اب اپنے ہی ہم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وطن ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر لکھنے سے قبل یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ برصغیر میں مسلم حکومت نے اپنے ابتدائی عہد میں ہندوؤں کی تعلیم کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں کیا، لیکن اس نے عمومی طور پر ہندوؤں کے قدیم اور مذہبی اداروں میں کوئی دخل بھی نہیں دیا۔ کیونکہ غیر مسلم شہریوں کی مذہبی اور علمی آزادی کے حق کو ماننا، مسلم حکومت کے مذہبی عقیدے کا ہمیشہ ایک جز رہا۔ چنانچہ ہندو پوری آزادی سے اپنے مذہبی اور علمی اداروں کو قدیم طرز پر چلا رہے۔

"ہندوستان میں تعلیم کی ترقی" کے مصنف لا اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

ابھی وہ دن دور تھا کہ ہم مسلمان حکمرانوں کو اپنی رعایا۔ ہندو اور مسلمان۔ کی تعلیم کی برابر سرپرستی کرتے ہوئے اور ایک ہی جوش کے ساتھ غیر مسلم قوموں کے علوم کو ترقی دیتے ہوئے پائیں۔ ہندوستان میں پہلے مسلم فاتح کے قدم جمنے کے ایک یا دوسری صدی تک ہندوؤں کی تعلیم اور ان کے علوم اپنی (قدیم) آزاد روش پر اپنے حامیوں کی مدد سے چلتے رہے۔" چنانچہ ہندو اپنی قدیم علمی روایات پر قائم رہے اور مسلم حکمرانوں کی ثقافتی و سرکاری زبان فارسی پڑھنے سے بھی اجتناب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر لودھی کے عہد میں ہندوؤں نے فارسی زبان پڑھنا شروع کی۔ اور اسلامی لٹریچر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس حد تک مسلم زبان و روایات پر عبور کیا کہ بقول بدایونی عہد اسکندری کے شعرا میں سے ایک برہمن بھی تھے، کہ کفر کے باوجود علوم رسمی پڑھاتے تھے۔ (۳۸) دبستان مذاہب میں یہ واقعہ بھی دلچسپی سے پڑھا جائیگا کہ بہ عہد اکبر و جہانگیر، آگرہ میں کامران نامی فلسفی رہتا تھا، جو نہ صرف اسلام کے علوم نقلیہ اور عقلیہ کا ماہر تھا، بلکہ ہندو دھرم اور عیسائیت پر بھی نظر رکھتا تھا۔ اس نے پورے طور پر قدیم فلسفیوں کے طور طریقے اپنا رکھے تھے۔ مذہب اور اہل مذہب کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا تھا، لیکن اخلاقی فضائل کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائل تھا۔ ہر کسی کو شاگردی میں قبول نہیں کرتا تھا' خاص طور پر فاسق و فاجر لوگوں کو' اس آزاد منش فلسفی کے دائرہ تلمذ میں عبدالرسول' ملا یعقوب اور ملا عصام کے نام ملتے ہیں' ان لوگوں نے کامران سے جہاں فلسفہ' بلاغت اور اصول فقہ کی آخری کتابیں پڑھیں' مثلاً شرح اشارات' شفاء' توضیح تلویح' وہاں ملا یعقوب نے اس سے تفسیر بیضاوی بھی پڑھی تھی۔ (۳۹) ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں غیر مسلم شہری نہ صرف حصول علم میں سرگرم عمل تھے' بلکہ درس و تدریس کی رونق کو بڑھانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہندو عہد اسکندری کے بعد سے مسلم مدارس سے برابر استفادہ کرتے رہے اور اپنے مذہبی مدارس کا بھی اہتمام کرتے رہے۔ حکمرانوں نے اسلامی روایات کا پاس کرتے ہوئے ان کی درس گاہوں میں کبھی مداخلت نہیں کی' اگر کسی حکمران نے اپنے طور پر ایسا غیر دانشمندانہ قدم اٹھایا' تو یہ اس کا ذاتی فعل تھا' جس پر اسے کبھی علمائے حق کی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ مثلاً ایک دفعہ اسکندر لودھی نے ہندوؤں کی مذہبی رسوم کو ختم کرنے کے لیے علماء سے فتویٰ پوچھا تو ایک عالم نے کہا کہ ہندوؤں کے قدیم تپکدوں کو ویراں یا مسمار کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ہندوؤں کو کسی خاص مقام پر غسل وغیرہ سے روکنا جائز ہے۔ سکندر کو یہ بات پسند نہ آئی اور غصے سے خنجر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ تم کفار کی حمایت کرتے ہو' اس لیے پہلے تمہارا سر قلم کرتا ہوں۔ اس پر اس حق گو نے کہ علمائے آخرت میں سے تھا' کہا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' شرع کے مطابق کہا ہے۔ رہا میری موت کا سوال! تو یہ امر صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس جواب پر سکندر لودھی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ (۴۰) مغل دور میں حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔ اکبر اور جہانگیر نے علمی میدان میں بھی مسلمان اور ہندو دونوں کی سرپرستی کی۔ اکبر کے زمانہ میں جب راجہ توڈرمل نے فارسی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مملکت کا سارا کاروبار فارسی زبان میں انجام دیا جانے لگا تو ہندوؤں نے تحصیل علم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے نتیجہ میں بقول ایک مغربی سیاح (P. (DELLA VALLA "تمام لوگ (ہندو اور مسلمان) امن و آتشی سے مل جل کر رہتے ہیں، کیونکہ مغل بادشاہ، ہر چند کہ مسلمان ہے اپنی قلمرو میں رعایا میں کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھتا، دربار، فوج، حتی کہ سب سے بڑے منصب کے لیے سب کو (مسلمان اور ہندو) برابر کے مواقع میسر ہیں۔" (۴۱) مغلوں نے نہ صرف ہندوؤں کی عبادت گاہوں اور درس گاہوں میں مداخلت نہیں کی، بلکہ اجتماعی اور معاشرتی حقوق میں بھی ہندو اور مسلم کی تمیز روا نہیں رکھی۔

کہا جاتا ہے کہ عالم گیر کے عہد میں یہ رسم ٹوٹ گئی۔ مآثر عالمگیری کے مصنف نے لکھا ہے کہ "ٹھٹھہ، ملتان اور بنارس میں مقامی گورنروں نے بادشاہ کے حکم سے بے دینوں (ہندو) کے مدارس اور عبادت گاہوں کو ڈھا دیا اور ان میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی، جنہیں برہمن اساتذہ اپنے ہندو، مسلم شاگردوں کو پڑھاتے تھے، تدریس روک دی۔" (۴۲) مرحوم سید سلیمان ندوی نے عالم گیر کے اس قدم کو تنگدلی سے تعبیر کیا ہے، (۴۳) ہر چند شاہی فرمان میں لفظ برہمن بطالت نشاں آیا ہے، ہماری رائے میں شاہی فرمان میں لفظ بے دین، فلسفی مزاج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے بولا گیا ہے۔ اہل فلسفہ کے بارے میں عالمگیر کا یہ فرماں کوئی اچھوتا فرمان نہیں تھا، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ شمس الدین التمش سے بقول برنی کہا گیا کہ وہ فلسفہ، اہل فلسفہ اور ان کے ہم نوا آدمیوں کو ملک سے باہر نکال دیں اور انہیں ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ ہر چند التمش نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا، لیکن اہل فلسفہ کے بارے میں علمائے دربار کی چشم تنگ کا راز ضرور کھل گیا۔ جو ہمیشہ کثرت جلوہ میں وحدت کا نظارہ کرنے سے قاصر رہی، اور زندہ دلی ان کے ہاں برابر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جرم شمار ہوتی رہی۔ چنانچہ عالم گیر نے جہاں ملتان اور بنارس کے ہندو مدارس کو بند کرنے کا حکم دیا' وہاں اس نے برصغیر کے معروف صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی کی کتاب "تسویہ" کو بھی جلانے کا حکم دیا تھا۔ عالمگیر کو حضرت شیخ کی اس عبارت پر اعتراض تھا:۔

"جبریل محمد در ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہم چنیں جبریل باہر پیغمبرے بود' وآں قدرت باطنی ایشاں بود کہ در غلبہ آں قوت وحی براایشاں نازل می گردید' و لہٰذا جبریل باہر پیغمبرے بزبان وے سخن گفتہ۔" (۴۴)

شیخ محب اللہ الہ آبادی کے علاوہ عالم گیر نے ایک دوسرے فرمان کے ذریعہ شیخ احمد سرہندی کے معروف مکتوبات کا پڑھنا ممنوع قرار دیا' حالانکہ عالمگیر شیخ موصوف کے جانشینوں سے خوشگوار تعلقات رکھتا تھا۔ غرضیکہ عالمگیر نے اصولی طور پر ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی تدریس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی' البتہ ان کی بعض عبادت گاہوں کو ڈھانے کا حکم ہماری سرحد ادراک سے پرے ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہ حکم سیاسی بنیادوں پر دیا گیا ہو اس کی وجہ یہ ہو کہ ہندو مدارس اور عبادت گاہوں میں مسلمان طالب علم' برہمنوں سے پڑھتے تھے۔ یہ امر عالمگیر کی نگاہ میں مسلم طلبہ کو "بے دین" بنانے کا ایک ذریعہ تھا' القصہ ہندوؤں نے عہد اسکندری سے مروجہ تعلیمی نصاب کو پڑھنا شروع کیا' مغل دور میں علم و ادب کی کوئی ایسی شاخ نہ تھی' جس پر عبور حاصل کرنے کے لیے وہ مسلمانوں سے پیچھے رہے ہوں' حتیٰ کہ ان کی فارسی کتابیں مسلمان بچوں کو پڑھائی جانے لگیں۔ نوندہ رائے کی دستور الصبیان' ٹیک چند اور مادھورام کی کتابیں بڑی مقبول ہو گئیں۔ "اور فارسی دانی کی وجہ سے ان کی قدرت' زبان اردو پر بھی اتنی ہو گئی تھی کہ ان کا کلام ہندو اور مسلمانوں میں عموماً مقبول اور مرغوب ہوا ہے اس بات سے کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مرزا قتیل جو قوم کے ہندو تھے، ہندوستان کے نہایت عالی مرتبہ شعرائے فارسی میں اپنے زمانہ میں شمار ہوتے تھے، اور ان کا نام اور غزلیں اور کلام اب تک شہرہ آفاق ہے" (۴۵) مسلمانوں کے نظام تعلیم سے گہرے تعلق کی بناء پر ہندوؤں نے وقت کے پہلو بہ پہلو چلنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا اور اپنے فکرو نظر کے افق کو وسیع کر لیا تھا، جس نے ان کی قومی زندگی کے خدوخال کو سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کیا چنانچہ جونہی مغلوں نے ہندوستان کے سیاسی سٹیج کو انگریزوں کے لیے خالی کیا، ہندوؤں نے برطانوی ہندوستان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں جو بھرپور کردار ادا کیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔

برطانوی ہندوستان میں ملک کی تعلیمی حالت پر متعدد رپورٹیں لکھی گئیں، سب سے پہلے ۱۷۹۲ء میں چارلس گرانٹ نے اہل ہند کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ لکھی اور اسے ۱۷۹۷ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے سامنے پیش کیا، گرانٹ نے اپنی رپورٹ میں ہندوؤں اور خاص طور پر مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا ذکر کرنے کے بعد کہا:۔

> "مختصر یہ ہے کہ ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ ایک نہایت ہی بگڑی ہوئی اور ذلیل قوم ہیں۔ اور ان کو اخلاقی فرض کا بہت ہی کم خیال ہے اور حق الامر کی پروا نہ کرنے میں بہت ہی شہ زور برائی سے جو سوسائٹی پر (برے اثرات چھوڑتی ہیں) ان کے پورے نمونے ہیں ... اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے مصیبتوں میں گرفتار ہیں ... میں خوب سمجھتا ہوں کہ ... بے ضرورت یا حقارت کی راہ سے کسی فرد یا افراد کے عیوب کو ظاہر کرنا نہایت برا جانتا ہوں۔ اگرچہ میں نے برائیاں دکھائی ہیں۔ مگر اس سے میرا مقصد نفرت دلانا نہیں بلکہ رحم دلانا ہے ... جو چیز کہ ہم کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اول سکھانی چاہیے اور جو کہ باقی اور چیزوں کے سکھانے کا ذریعہ ہو گی، ضروری طور سے انگریزی زبان ہے۔ یہی وہ کنجی ہے جو ان پر (اہل ہند) دنیا بھر کے نئے خیالات کا دروازہ کھول دیگی اور صرف مصلحت ملکی نے ہم کو اس وقت تک ان کے ہاتھ میں یہ کنجی دینے سے روکا تھا۔" (۴۶)

اس رپورٹ کے بعد اور رپورٹیں بھی لکھی گئیں اور طے کیا گیا کہ انگریزی تعلیم کی یہ "کنجی" اہل ہند کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ چنانچہ ایک طرف حکومت نے عربی اور سنسکرت کے کالج قائم کئے۔ دوسری طرف انگریزی کالجوں کے قیام کا بھی انتظام کیا۔ جس سے مسلمانوں نے اجتناب کیا، لیکن ہندوؤں نے فائدہ اٹھایا۔ انگریزی تعلیم سے ہندوؤں کی دلچسپی کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ جب ۱۸۲۴ء میں حکومت نے کلکتہ میں عربی کالج کی طرز پر سنسکرت کالج کھولنا چاہا، تو شہر کے معزز ہندوؤں نے راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں سنسکرت کالج کی بجائے انگریزی کالج کے قیام کا مطالبہ کیا، حالانکہ ہندوؤں نے ۱۸۱۶ء میں اپنے مصارف سے انگریزی کالج قائم کر دیا تھا۔ (۴۷) لیکن جب ۱۸۳۵ء میں حکومت نے عربی اور سنسکرت کے لیے وظائف بند کئے اور تعلیم کے لیے مخصوص میزانیہ کو انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جانے لگا، تو کلکتہ کے مسلمانوں نے حکومت کی خدمت میں درخواست دی کہ حکومت کی پالیسی سے رعایا میں حکومت کے خلاف ناراضگی پیدا ہو گی۔ اس درخواست پر آٹھ ہزار مسلمانوں نے دستخط کئے تھے۔ جن میں شہر کے امراء، روساء اور علماء شامل تھے۔ انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی بے التفاتی پر مرحوم سید محمود نے لکھا تھا:۔

"زمانہ اپنی رفتار کو کسی کی خاطر روکتا نہیں ہے۔ اور نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کو کسی خاص قوم یا فرقہ سے مطلب ہے اور نہ ہی اس کو اس بات کی پرواہ ہے کہ جو قوم و ملت انقلاب روزگار اور اقتضائے زمانہ سے ناآگاہ ہے یا بے پروا رہتی ہے' اس پر کیا مصیبتیں آئیں گی۔" (۴۸)

انگریزی رپورٹوں میں یہ تبصرہ بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ سنسکرت یا عربی کالجوں میں' جہاں انتظامیہ انگریزوں کے ہاتھ میں ہے' دی جانے والی تعلیم ان مقامی مدارس (ہندو یا مسلم) سے کہیں بہتر ہے' جن کا انتظام اہل ہند کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی وجہ مقامی مدارس میں ناقص طریقہ تعلیم کو قرار دیا گیا' جس کی وجہ سے تعلیم پر عمر کا ایک حصہ صرف کرنے کے بعد بھی "دھرم شاستر یا شرع محمدی ﷺ" میں مہارت پیدا نہیں ہوتی۔" انہیں رپورٹوں میں ایک رپورٹ ولیم آدم نے لکھی۔ آدم نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہرچند کہ فارسی مدارس کے اساتذہ فکری طور پر ہندو اساتذہ سے برتر ہیں' ایسے ہی ان کی تنخواہ بھی زیادہ ہے' لیکن ان مدارس میں روحانیت کی کمی ہے۔ یہاں فارسی' عربی اور قانون کی تعلیم معاشی نقطہ نظر سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طالب علم مفت پڑھتے ہیں' البتہ داخلہ اعلیٰ ذات ہی کے ہندوؤں کو ملتا ہے۔ طالب علم سادہ اور سخت زندگی بسر کرتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ علم روحانی کمال کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات سخت ریاضت اور صفائی قلب ہی سے حاصل ہوتی ہے غرضیکہ یہ ادارے قدیم ہندو نظریات کے حامل ہیں' انیسویں صدی میں انگریزی راج کے جلو میں جہاں نئی زندگی آرہی ہے' یہ ادارے اس سے بھی باخبر ہیں(۵۰)' ایک دوسری رپورٹ میں کہا گیا کہ (مسلمانوں کی تعلیم میں) سائنس اور آزادی خیال مفقود ہے۔ نیز یہ کہ مکتب ملاؤں کے ہاتھ میں ہیں' جن کی تعلیم طالب علم کو عمل پر اکساتی نہیں' بلکہ کاہل اور بے ذوق بنا دیتی ہے۔ مسلمانوں کی اقتصادی بے بسی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۱۷۸۰ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی پڑھی لکھی تعداد نے بقول وارن ہسٹنگز، اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کوئی مدرسہ قائم کریں۔ چنانچہ اس نے کلکتہ مدرسہ قائم کیا، جس کا مقصد، عربی فارسی اور اسلامی قانون کی تعلیم تھا۔ اس مدرسہ میں مقامی طالبعلموں کے علاوہ باہر کے طالب علم بھی پڑھتے تھے۔ شروع میں چالیس طالب علموں کے لیے ہوسٹل میں ٹھہرنے کا انتظام تھا، بعد میں یہاں پر سو طالب علموں کے قیام کا انتظام کیا گیا، مدرسہ میں پورے ملک سے طالب علموں نے آنا شروع کر دیا۔ ۱۷۹۱ء میں اس مدرسہ میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ نیچرل فلاسفی، کلام، قانون، ہیئت، جیومیٹری، حساب، منطق، بلاغت، گرائمر۔

مدرسہ میں تعلیم کی مدت سات سال تھی۔ ولیم آدم نے اپنی تیسری رپورٹ ۱۸۳۸ء میں لکھا:

۱۔ ذریعہ تعلیم، مقامی زبان ہونی چاہیے۔

۲۔ انتظامیہ، حتی الامکان، مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

۳۔ مفید اور ٹھوس تعلیم کے لیے روحانی رہنماؤں اور تعلیم یافتہ حضرات کا تعاون ضروری ہے۔

۴۔ انگریزی زبان کو ایک مضمون کی حیثیت سے اونچی کلاسوں میں پڑھایا جائے۔ (۵۱)

تعلیم میں مسلمانوں کی پس ماندگی کی ذمہ داری جہاں فکری مسائل سے ان کی بے اعتنائی پر عائد ہوتی ہے، وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ان کے اقتصادی اور معاشی استحصال پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اقتصادی پالیسی نے جو لوٹ کھسوٹ پر مبنی تھی، اہل ہند کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص بہت نقصان پہنچایا، تعلیمی اداروں سے وابستہ جاگیریں چھین لی گئیں۔ جس سے بنگال میں بقول ہنٹر مسلمانوں کی علمی زندگی نے دم توڑ دیا۔ آفت یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آفت یہ آئی کہ ولیم آدم کی سفارش کے برعکس میکالے نے اپنی ایک معروف تقریر میں (۲ فروری ۱۸۳۵ء) انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی، جسے حکومت نے تسلیم کرلیا۔ فارسی پر انگریزی زبان کی سیاسی فتح نے ہندوستان کی علمی زندگی کو ویران کر دیا، اور فارسی کو اجتماعی اور سرکاری زندگی سے نکال باہر کیا۔ جس سے مسلمانوں کو نئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میکالے نے اپنی اس تقریر میں اعتراف کیا کہ وہ عربی اور سنسکرت زبان سے ناواقف ہیں، لیکن پھر بھی اس نے دونوں کا مذاق اڑایا اور کہا:-

> "میں ذاتی طور پر عربی یا سنسکرت زبان سے واقف نہیں، لیکن میں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں کے تراجم پڑھے ہیں، ایسے ہی ان زبانوں کے ماہرین سے بھی علمی بات چیت کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مغرب کی کسی بھی لائبریری کی ایک الماری کی قیمت ہندوستان، اور عرب کے تمام سرمایہ فکر کے برابر ہے۔ مغربی لٹریچر کی برتری کا اعتراف کمپنی کے ان ممبروں کو بھی ہے جو مقامی زبانوں کی حمایت کر رہے ہیں۔"

میکالے نے انگریزی زبان کی تعریف کرنے کے بعد کہا:

> "موجودہ وقت میں ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایک ایسے طبقہ کو پیدا کریں جو ہمارے اور ہمارے محکوم باشندوں کے درمیان ترجمان بن سکے، جو اپنے خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے مذاق فکر، رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز۔" (۵۲)

ایک طرف مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گئے تھے، اور جہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے تھے' وہاں ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق انہیں میدان چھوڑنے پر مجبور کیا گیا' جیسا کہ پنجاب میں ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار لائٹ نر کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں مسلمان محکمہ تعلیم میں چھائے ہوئے تھے' ان کے قائم کردہ فارسی مدارس میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھتے تھے' ان مدارس میں فارسی کی کلاسیکی کتابیں مثلاً پند نامہ' گلستان' بوستان' سکندر نامہ' رقعات ابوالفضل وغیرہ پڑھائی جاتی تھیں۔ لائٹ نر نے پنجاب سے متعلق سرکاری تعلیمی رپورٹ پر تنقید کی اور بتایا کہ جب پنجاب برطانوی قلمرو میں داخل ہوا' تو ایک منصوبے کے تحت مسلمانوں کو شعبہ تعلیم سے خارج کیا گیا۔ مسلمانوں کے فارسی اور قرآنی مدارس کو تباہ کیا گیا' لیکن خود سرکاری مدارس نے سطحی تعلیم کو پھیلانے میں جو کردار کیا' اس کے پیش نظر والدین نے اپنے بچوں کو سرکاری مدارس میں بھیجنا بند کر دیا۔ ان مدارس نے آداب کا اس حد تک مذاق اڑایا کہ ۱۸۷۳ء میں خود پنجاب کے گورنر کو کہنا پڑا:

> "انگریزی زبان اور انگریزی لٹریچر کو سائنٹیفک یا عمدہ سسٹم کے تحت پڑھایا نہیں گیا' جس کے نتیجہ میں پنجاب میں انگریزی تعلیم کامیاب نہیں رہی' ایسے ہی اس نظام تعلیم نے جو سکالرز پیدا کئے' وہ مذہبی آدمیوں کی تخلیق میں زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ لیفٹیننٹ گورنر کی یہ خواہش ہے کہ محکمہ تعلیم کو خاص طور پر اچھے آداب پر' جو مشرقی نوجوانوں کا زیور ہیں' توجہ دینی چاہیے۔ اس امر سے اب تک بے التفاتی برتی گئی۔ چنانچہ اچھے خاندانوں کے بچوں کو سرکاری مدارس میں بھیجنے کا اب تک یہ نتیجہ نکلا ہے کہ وہ گستاخ' خود فریبی کا شکار' آزاد اور بے ادب بن کر واپس گھر لوٹے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ ان امور کے پیش نظر یہ بات موجب حیرت نہیں کہ والدین اپنے بچوں کو گھر ہی پر تعلیم دینے کی خواہش رکھتے ہیں، اگر انگریزی تعلیم کا یہ مطلب ہے کہ غلط سلط انگریزی لکھنے، بولنے میں آدمی کو ایک حد تک واقفیت ہو جائے یا انگریزی ادب اور تاریخ سے سطحی شناسائی، تو پھر ایسی انگریزی تعلیم کی ضرورت نہیں، انگریزی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی ادب کے عظیم مصنّفین کی روح میں اترا جائے، ان کے افکار کی عظمت، خوبصورتی، شرافت، تہذیب اور حکمت کو جذب کیا جائے اور زندگی کو ان کے نقطہ نظر کے مطابق ڈھالا جائے۔ تعلیم کا یہ وہ معیار ہے جس پر محکمہ تعلیم کو پورا اترنا چاہیے۔ (۵۴)

القصہ لائٹ نر کی رپورٹ نے پنجاب میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے بارے میں حکومت وقت کے معاندانہ موقف کو بیان کیا اور بتایا کہ سرکاری تعلیم نے کیونکر مسلمانوں کے فارسی مدارس اور اساتذہ کو تباہ کیا، ایک طرف مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں پیچھے دھکیلا جا رہا تھا، دوسری طرف ان کی مذہبی روایات اور دینی عقائد کے خلاف بھی پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ پادری برسرعام ہندو دھرم اور اسلام پر حملے کرتے تھے اور بعض اوقات رکیک زبان استعمال کرتے تھے، حتی کہ سرسید احمد مرحوم جیسے محتاط اور انگریزی حکومت کے حامی آدمی کو کہنا پڑا کہ اسلام اور ہندو مت کے بارے میں پادریوں کے غیر مہذب رویے اور اہل ہند کی اقتصادی زبوں حالی نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسید نے اخلاقی جرات سے کام لیتے ہوئے اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں حکومت کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا ذمہ دار قرار دیا۔ اور بتایا کہ حکومت اور رعایا کے درمیان عدم اعتماد کی خلیج نے ''غدر'' کو جنم دیا ہے۔ اس خلیج کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانے کے لیے سرسید نے وائسرائے کی کونسل میں اہل ہند کی شرکت کو ضروری قرار دیا۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ ۱۷۹۳ء میں برطانوی دارالعوام میں یہ سوال زیر بحث آیا کہ آیا کمپنی بشپ مقرر کر کے تبلیغ کا کام بھی سرانجام دے سکتی ہے؟ ایک رائے یہ تھی کہ کمپنی کو ایسا کرنا چاہیے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ کمپنی کو مذہبی تبلیغ سے الگ رہنا چاہیے' کیونکہ اس طریق سے مذہبی لوگوں کو نہ صرف ہندوستانی سیاست میں دخل اندازی کا موقع ملے گا' بلکہ وہ برطانوی انتظامیہ پر بھی اثرانداز ہونے کی کوشش کریں گے۔ ایک زوردار بحث کے بعد پہلی رائے کو اختیار کر لیا گیا اور ۱۸۱۳ء میں کمپنی کے چارٹر میں اس دفعہ کا اضافہ کر دیا گیا کہ کمپنی بشپ مقرر کر سکتی ہے۔ البتہ بشپ کو ایک قانون کے ذریعہ انتظامیہ میں مداخلت کرنے سے روک دیا گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مذہبی لوگوں کو ہندوستان کے خزانہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ (۵۴) القصہ اسلام اور ہندوازم کے بارے میں پادریوں کے جارحانہ رویے کا باعث کمپنی کی یہی جانبدارانہ پالیسی تھی' جس سے اہل ہند کبیدہ خاطر تھے۔ اور مذہبی روایات کے بارے میں فکر مند' اس صورت حال نے عوام کے جذبات کو بری طرح سے مجروح کیا حتی کہ ۱۸۵۷ء میں وہ پوری طرح سے بھڑک اٹھے اور ہر طرف بدنظمی کا بازار گرم ہوگیا' جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بیمار معاشرے کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ انقلاب کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو فکر سے عاری اور نظم و ضبط سے بے خبر تھے' ان کے سامنے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا۔

> "دستاویزی شہادتوں کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ بغاوت ہند نہ تو محتاط منصوبہ بندی کا نتیجہ تھی اور نہ ہی کسی کے انقلابی دماغ کی پیداوار' غدر نتیجہ تھا ان نفرت انگیز جذبات کا جو ایک صدی کے عرصہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں کمپنی کی حکومت کے خلاف راہ پا چکے تھے۔ ہندوستانیوں کو یہ احساس اور شعور ہو چلا تھا کہ بیرونی نسل نے ان کے ملک میں غلبہ و تسلط حاصل کر لیا ہے۔ جب عوام پر یہ احساس غالب ہو گیا تو اس نے سرکشی اور بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔" (۵۵)

افراتفری کا یہ عالم تھا کہ خود اہل وطن "انقلابی فوج" سے محفوظ نہیں تھے۔ پوربی تلنگے کہتے تھے کہ جس کے سر پر ہم جوتا رکھ دیں گے، وہی بادشاہ ہو گا۔

چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا یعنی "انقلاب" بری طرح ناکام ہوا، خود بہادر شاہ جس کے نام سے انقلاب کا جھنڈا بلند کیا گیا، اس انقلاب پر اسی قدر حیران تھا جس قدر کہ برطانوی حکومت۔ چنانچہ دہلی میں انگریزی فوج کے تسلط کے بعد اہل ہند بری طرح سے تباہ ہوئے، خاص طور پر مسلمان حتیٰ کہ غالب جیسے قصیدہ گو شاعر کو خون جگر سے یہ لکھنا پڑا:

"دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا... اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفےٰ خان، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خان، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم۔"

مسلمانوں کی حالت زار پر غالب اپنے خطوط میں جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور اس کے خوفناک نتائج پر اچھوتی دستاویز ہیں، مزید لکھتے ہیں:

"معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیہ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینے پاتے ہیں، اناث (عورتیں) میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں، کسبیاں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعہ یہ ہے کہ جہاں اس ہنگامے میں اہل ہند کی بد نظمی' اہل وطن کے لیے بے پناہ مصیبتوں کا موجب بنی' وہاں انگریزی فوج کے وحشیانہ سلوک نے مغربی تمدن اور اخلاقی روایات کے چہرے سے بھی نقاب الٹ دی۔ دہلی کے باشندوں کو آگ اور خون کے دریا سے گزرنا پڑا' اس تاریک اور بھیانک دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے جو لوگ سامنے آئے' ان میں سرسید احمد خانؒ (وفات ۱۸۹۸ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (وفات ۱۸۸۰ء) بھی تھے' جنہوں نے آگے چل کر بڑا نام پیدا کیا۔ سرسید احمد نے مقدور بھر روح عصر کو پہچاننے کی کوشش کی۔ مسلم قوم کی اجتماعی زندگی اور نئے حالات کی سنگینی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کی اجتماعی' سماجی اور اقتصادی مشکلات کی ذمہ داری ان کی جہالت اور وقت کے تقاضوں سے ان کی بے اعتنائی پر ہے' سرسید نے لکھا کہ مسلمان' خاص طور پر کھاتے پیتے گھرانے اپنے بچوں کو سکول میں پڑھانا عیب گردانتے ہیں اور اپنی جھوٹی روایات کی توہین۔ (۵۶) چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انہیں جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں آنا چاہیے اور یہ بات تبھی ممکن ہے کہ علم نے مغرب میں جو نئی شکل و صورت اختیار کی ہے' اس سے شناسائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے انگریزی علوم پڑھنے پڑھانے پر زور دیا اور اس راہ میں آنے والی مشکلات کا نہایت ہی صبر و تحمل سے مقابلہ کیا۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی اور طریق کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے' جیسا کہ جمال الدین افغانی نے کیا' لیکن تعلیم سے متعلق ان کے بنیادی فکر سے آج شاید ہی کوئی اختلاف کر سکے کہ علم بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث ہے' اس سے دوری موت۔ سرسید کے اس خیال سے ان کے حریف افغانی کو بھی اختلاف نہیں تھا۔ افغانی کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ نئی تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور اس فلسفہ کو اختیار کرنا ضروری ہے' جو مغربی تعلیم و ثقافت کے پیچھے کام کر رہا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اپنی روایات کا وفادار بھی رہنا چاہیے۔ (۵۷) افغانی کے برعکس سرسید نے نہ صرف مغربی علوم پڑھنے کا مشورہ دیا بلکہ انگریزی معاشرت کو اختیار کرنے کا بھی نعرہ لگایا اور اسے مادی ترقی کا زینہ قرار دیا۔ سرسید کا یہ طرز عمل جو صحیح نہیں تھا' یقیناً نئی سیاسی طاقت کے جلو میں آنے والی ثقافتی یلغار کا ردعمل تھا۔ سرسید سے اختلاف کے باوجود اس بات کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ انہوں نے جو بھی راہ اختیار کی اخلاص سے اختیار کی' وہ اہل ہند کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً باوقار اور خوش حال دیکھنا چاہتے تھے اور یہ بات ان کے خیال میں انگریزی تعلیم ہی کی راہ سے ممکن تھی۔ سرسید کے برعکس ان کے معاصر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ نئی تہذیب اور سیاسی قیادت مسلمانوں کی تاریخی میراث کے لیے خطرناک ہے' اس لیے انہیں اپنی میراث اور پرانی روایات کو بچانا چاہیے۔ مولانا نے انگریزی تعلیم کی مخالفت نہیں کی لیکن انہوں نے اپنے تعلیمی پروگرام میں انگریزی تعلیم کو کوئی جگہ بھی نہیں دی۔ شاید اس لیے کہ انگریزی علوم کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی' اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے روایتی علوم سرکاری سرپرستی سے محروم تھے' اگر انہیں سہارا نہ دیا گیا تو مسلمانوں کا اپنے ماضی سے رشتہ ٹوٹ جائے گا اور یہ امر مسلمانوں کے ملی مفاد کے خلاف تھا۔ وقت نے مسلمانوں کے سامنے جو نئے مسائل لاکھڑے کیے تھے' ایک نے ان کو حل کرنے کے لیے نئی تعلیم کو اپنایا اور دوسرے نے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ جدید حالات نے انہیں قدامت پسندی کی راہ پر لگایا۔ چنانچہ انہوں نے جدید صورت حال کو ملی وراثت کے لیے خطرہ تصور کیا اور اس میراث کو بچانے کے لیے قلعہ بند ہو کر بیٹھنے کی پالیسی اختیار کی۔ رہا یہ امر کہ وقت کا مزاج کیا ہے؟ نئے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے کیا کیا جائے؟ یا مسلمانوں کو نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے لیے کیا قدم اٹھانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے؟ غرضیکہ ان امور پر انھوں نے سنجیدگی سے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا۔ یوں نظر آتا ہے کہ وقت کے ان دو ممتاز اہل درد نے لاشعوری طور پر اپنے لیے تقسیم کار کر لیا تھا' ایک نے تعلیم کو روح عصر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرانا ضروری جانا' دوسرے نے قدیم علمی ورثے کو بچانا وقت کا اہم مسئلہ قرار دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حواشی

۱۔ الفیروز بادی: بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، ج ۱ ص ۴۵، ۴۶

۲۔ فجر الاسلام، ص ۱۶۵، ضحی الاسلام، ج ۲ ص ۵۰۔ ۵۳

۳۔ مقدمہ، فصل فی تعلیم الولدان و اختلاف الامصار الاسلامیۃ فی طرقہ

۴۔ یاقوت: معجم الادباء، ج ۱ ص ۴۷، ۴۸ (کیمبرج)

۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ شبلی: رسائل شبلی، ص ۴۰۲ (قدیم تعلیم: دائرۃ المعارف الاسلامیہ، انگریزی، مقالہ مسجد ص ۳۶۳ (طبع اول)

۶۔ الخطط، ج ۴، ص ۱۸۵

۷۔ فرشتہ نے لکھا ہے: "در جوار آں مسجد، مدرسہ بناء نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ، دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف نمود ... و بمقتضائے الناس علی دین ملوکہم، ہر یکے از امراء و اعیان دولت بہ بنائے مسجد و مدارس و رباطات و خوانق مبادرت نمودند" ج ۱ ص ۳۰

۸۔ سر ایچ، ایم، ایلیٹ: تاریخ ہند (انگریزی) ج ۲ ص ۲۱۵: این، این، لا: ہندوستان میں تعلیم کی ترقی (انگریزی)، ص ۱۸

۹۔ طبقات ناصری، ج ۱ ص ۴۵۷

۱۰۔ ایلیٹ: تاریخ ہند، ج ۲، ص ۲۲۳: لا: ہندوستان میں تعلیم کی ترقی، ص ۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۱۔ طبقات ناصری ج ۱ ص ۸۱۱، ۸۱۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۱۰

۱۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ابوالحسنات ندوی: اسلامی ہند کی قدیم اسلامی درسگاہیں: مولانا عبدالحی: ہندوستان میں قدیم نصاب در رسالہ "اسلام اور عصر جدید" دہلی، اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حمد اللہ، ملاحسن، قاضی مبارک، درس نظامی کا حصہ نہیں تھیں، اس کے برعکس فن موسیقی داخل نصاب تھا، "حالانکہ آج اس فن کا نام لینا بھی گناہ ہے" مقالات شبلی، ج ۳، ص ۱۲۴

۱۴۔ اس روایت کو تاریخ فرشتہ اور امیر خورد نے "سیر الاولیاء" میں نقل کیا ہے، لیکن الفاظ کے اختلاف کے ساتھ دیکھیے: سیر الاولیاء ص ۸۰۰۔ ۸۰۴ (ط۔ مرکزی اردو بورڈ)

۱۵۔ المعجب فی اخبار العرب، ص ۱۷۳

۱۶۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۳

۱۷۔ صبح الاعشیٰ ج ۵ ص ۶۹، قلقشندی نے مزید لکھا ہے کہ اہل ہند، فلسفہ، طب، ہندسہ اور دوسری عجیب و غریب صنعتوں میں سب سے آگے ہیں: و اهل الهند اعلم الناس بانواع الحكمة و الطب و الهندسة والصناعات العجيبة"

۱۸۔ سراج عفیف: تاریخ فیروز شاہی، باب نہم، مناروں کی تعمیر: لا: ہندوستان میں تعلیم کی ترقی، ص ۵۲۔ ۵۴

۱۹۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ فرشتہ: فیروز شاہ کے حالات: ایلیٹ: .بلوگرافیکل انڈکس، ج ۲ ص ۳۲۸: لا: ہندوستان میں تعلیم کی ترقی ص ۶۴، ۶۵

۲۰۔ مآثر الکرام، ص ۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۱۔ مغربی علماء نے توزک بابری کو دنیا کے بہترین سوانح میں شامل کیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ تیمور اور جہانگیر کی تحریروں سے برتر ہے' البتہ سیزر کی تفسیر Commentaries of Ceasar سے فروتر' ان کا خیال ہے کہ اگر بابر مغرب میں ہوتا تو شاید ہنری چہارم کے وجود میں جنم لیتا' ملاحظہ ہو' ایلیٹ: تاریخ ہند' ج ۴ ص ۲۱۸۔ ۲۸۷: جنرل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی' اکتوبر ۱۹۲۲ء' ص ۵۹۷' ۶۰۵' جواہر لال نہرو: تاریخ عالم' ج ۱ ص ۷۶' ۴' ۷۷

۲۲۔ انڈین اسلام' بحوالہ محمد اکرام: رود کوثر' ص ۲۳ (لاہور ۱۹۷۹ء)

۲۳۔ آئین اکبری ص ۱۴۳ (آئین آموزش) ان کتابوں کے لیے ابوالفضل نے ہندی علوم کا لفظ لکھا ہے۔ بلوچ مین نے اس کا سنسکرت ترجمہ کیا ہے' جسے ہر طالب علم پڑھتا تھا۔ ملاحظہ ہو آئین اکبری کلکتہ ایڈیشن ۱۹۲۷ء ص ۲۸۹

۲۴۔ مآثر الکرام ص ۲۳۸ (ترجمہ امیر فتح اللہ شیرازی): محمد حسین آزاد: دربار اکبری ص ۶۷۳۔ ۶۷۴' محمد حسین آزاد نے فتح اللہ کی تصنیفات کے ساتھ ساتھ ان کی ایجادات' مثلاً باد آسیا' آئینہ حیرت' توپ وغیرہ کی فہرست بھی دی ہے: بدایونی: منتخب التواریخ' ج ۱ ص ۳۱۵' ۳۱۶

۲۵۔ منتخب التواریخ' ج ۳' ص ۳۰۶' شاہ نواز نے مآثر الامراء میں کتابوں کی تعداد چار ہزار تین سو لکھی ہے۔

۲۶۔ سمتھ نے لکھا ہے کہ آئین اکبری میں آئین آموزش کے تحت نصاب تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں' اس پروگرام کے مطابق ہندوستان کے کسی سکول میں کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ صحیح بات یہ ہے کہ ابوالفضل نے تعلیم سے متعلق چند سطریں لکھ کر اکبر کے مقدس آستانے پر خوشامد کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو اکبر اعظم' ص ۲۸۰' نہرو کی رائے ہے کہ پریس نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم کا دائرہ نہایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محدود تھا' تاریخ عالم ص ۲۸۰' بے شبہہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ آج برصغیر پاک و ہند میں مغل دور کا کوئی علمی ادارہ باقی نہیں ہے۔

۲۷۔ گیرٹ: تراث ہند (انگریزی)' ص ۳۰۰۔ ۳۰۲ (ہندوستان پر اسلام کا ثقافتی اثر)

۲۸۔ ابوالکلام آزاد: غبار خاطر' ص ۲۸۰

۲۹۔ دہلی کے آثار باقیہ' (Monumental remains of Dehli) ص ۲۵۵

۳۰۔ لا: ہندوستان میں تعلیم کی ترقی' ص ۱۸۸ (حاشیہ) لاء نے یہ روایت مرات احمدیہ کے مصنف احمد علی خان سے نقل کی ہے۔

۳۱۔ ہنری کین: مغل شہنشاہیت (انگریزی) ص ۲۳

۳۲۔ محمد رضا انصاری: بانی درس نظامی' ص ۲۶۰' انصاری صاحب لکھتے ہیں کہ "درس نظامی کو اس بدعت (معقولات کا داخل نصاب ہونا) کا بانی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔" نیز ملاحظہ ہو علامہ شبلی: مقالات شبلی' ج ۳' ص ۱۰۲۔ ۱۲۵

۳۲۔ تاریخ فیروز شاہی' ص ۱۴۴' ۱۴۵

۳۴۔ خلیفہ سید محمد حسین: وقائع سیر و سیاحت' ڈاکٹر برنیر ج ۱ ص ۲۷۷۔ ۲۸۱ (ہم نے یہاں برنیر کی پوری عبارت کا خلاصہ دیا ہے۔)

۳۵۔ مکتوبات امام ربانی' دفتر اول' مکتوب ۲۶۶' شیخؒ فرماتے ہیں: از علم و منتظم ایشاں علم ہندسہ است' مالایعنی ست ولاطائل صرف' مساوات زاویایے ثلث و مثلث ہر دو قائمہ راچہ کاری آید" اسی مکتوب میں شیخؒ مزید لکھتے ہیں: کہ اہل فلسفہ کے ہاں علم طب اور علم تہذیب الاخلاق بہترین علم شمار ہوتے ہیں' لیکن یہ دونوں علم ہمارے پیغمبروں کے علم سے چرائے گئے ہیں' ایک دوسرے مکتوب میں شیخؒ فرماتے ہیں کہ آخر یہ علم' آخرت میں کس کام آئے گا؟ ملاحظہ ہو دفتر سوم مکتوب ۳۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۶۔ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔ فان مسائل الطبیعات لاتھمنا فی دیننا ولا معاشنا، فوجب علینا ترکھا" (مقدمہ، فصل فی ابطال الفلسفۃ)

۳۷۔ منتخب، ج ۲ ص ۳۲۳ "یکے از شعرائے عہد سلطان سکندر برہمن بود میگویند، کہ باوجود کفر کتب علم رسمی را درس می گفت۔"

۳۸۔ دبستان مذاہب، ص ۳۳۷۔ ۳۴۱ (ط۔ طھران، ۱۳۴۲ شمسی، ج ۱)

۳۹۔ فرشتہ اور طبقات اکبری نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ مسلم مورخین کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر لودھی کا مذہبی مزاج، نقطہ اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے متھرا اور دوسرے مقامات پر ہندوؤں کو اشنان کرنے یا سر منڈانے سے روک دیا تھا، جس پر علمائے حق نے اسے ایسا کرنے سے روکا تھا۔

۴۰۔ یوسف حسین خان: عہد وسطی کا ہندوستانی (انگریزی)، ص ۴ حاشیہ

۴۱۔ ساقی مستعد خان: ماثر عالم گیری، ص ۵۱۔ ساقی خان لکھتے ہیں: بہ عرض خداوندِ دین پرور رسید کہ صوبہ ٹھٹھہ و ملتان، خصوصاً بنارس، برہمن بطالت نشاں در مدارس مقرر بہ تدریس، کتب باطلہ اشتغال دارند... احکام اسلام نظام بہ ناظمان کل صوبہ جات صادر شد... کہ مدارس و معابد بے دیناں و ستخوش انہدام سازند۔"

۴۲۔ معارف، مئی ۱۹۱۸ء ص ۱۴، سید صاحب مرحوم نے معارف فروری ۱۹۴۷ء کے شذرات میں اس امر پر مسرت کا اظہار کیا تھا کہ پٹنہ کی تاریخ کانفرنس، میں ایک فاضل ہندو ڈاکٹر نے عالمگیر کے اس شاہی فرمان کو ایک سیاسی فرمان قرار دیا، جو خاص حالات میں جاری کیا گیا تھا۔

۴۳۔ مآثر الکرام، مقدمہ ص ۱۵۔ ۱۷، غلام علی آزاد نے سید محمد ترمذی اور میر سید احمد کے تراجم میں لکھا ہے کہ عالمگیر نے رسالہ "تسویۃ" کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاف علمائے ظاہر کے احتجاج پر تمام فقرائے سلطنت کو دہلی حاضر ہونے کا حکم دیا، فقراء کی فہرستیں بھی تیار کر لی گئیں، لیکن عالمگیر نے آخری وقت میں اپنے فیصلہ پر نظرثانی کرتے ہوئے شاہی فرمان کو واپس لے لیا، ص ۸۴۔ ۸۹

۴۴۔ سید محمد محمود: لیکچر (مسلمانوں میں انگریزی تعلیم از ۱۷۹۳ء تا ۱۸۹۳ء، ص ۳۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۹۔ ۱۴

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۶

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ہنری وائٹ ہڈ: ہندوستانی مسائل در مذہب، تعلیم، سیاست (انگریزی)، ص ۱۲۳۔ ۱۲۷

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۲۸

۵۱۔ منتخب تحریریں (از میکالے)، ص ۲۴۹ (انگریزی)

۵۲۔ لائٹ نر: پنجاب میں تاریخ تعلیم، ص ۶۵ (انگریزی)

۵۳۔ ہندوستانی مسائل، ص ۹۱۔ ۱۰۶

۵۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۵ر فروری ۱۹۵۵ء کو کمشن برائے تاریخی دستاویز، کے اجلاس میسور کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے، ملاحظہ ہو ایس۔ این۔ سین: ۱۸۵۷ء (مقدمہ از مولانا آزاد)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بارے میں پنڈت سندر لال لکھتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ نہ ہوئی ہوتی تو اس کا یہی مطلب تھا کہ ہندوستانیوں میں سے ہمت، خودداری، فرض شناسی اور حقیقی زندگی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا۔"

پنڈت جی کا کہنا ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے جاپان اور چین، مغربی قوموں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

براہ راست تسلط سے بچے رہے۔ ملاحظہ ہو: ۱۸۵۷ء

۵۵۔ سرسید مرحوم نے یہ بات یکم جنوری ۱۸۶۰ء کو مراد آباد مدرسہ میں کہی تھی، ملاحظہ ہو: "رپورٹ امتحان مراد آباد مدرسہ"

۵۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کا مقالہ، "جمال الدین افغانی" در فکر و نظر، اسلام آباد، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۸۱۔ ۱۱۲

© rasailojaraid.com